بسم الله الرحمن الرحيم

اللہ کے بابرکت نام سے جو مہربان اور رحیم ہے

اک عشق تھا سو ہو گیا اک کرب ہے جو سہہ لیا
یہ بھی تو اک کمال ہے وہ بھی تو اک کمال تھا

لمس

سہیل ثاقب

ISBN: 978-969-7578-01-6

urdusukhan@urdusukhan.com www.urdusukhan.com

اردو سخن

آرٹ لینڈ، گرلز کالج روڈ، اردو بازار چوک اعظم (لیہ) فون: 0302-7844094

اسٹاکسٹ: ادارہ فکرو دانش، الحمد پلازہ، اردو بازار لاہور

عنوان: لمس LAMS

شاعر: سہیل ثاقب Suhail Saqib

استحقاق: تمام تصرفات "اردو سخن" کی تحویل میں ہیں

ناشر: اردو سخن ڈاٹ کام، پاکستان

نمودِ اول: اپریل 2015ء

حرف بین: یاسر رزاق

سرورق: ناصر ملک

طباعت: شیرِ ربانی پریس، ملتان

قیمت: 400 روپے (20 یورو، 25 ڈالر)

SUHAIL SAQIB
P.O. BOX 5190, SEC HQTRS-ISD.
DAMMAM-31422. KSA. **Cell:0508598727**

B-43, BLOCK T. NORTH NAZIMABAD
KARACHI. PAKISTAN. **Cell:03333895045**

EMAIL: suhailc@hotmail.com

urdusukhan@urdusukhan.com www.urdusukhan.com

اردو سخن

آرٹ لینڈ، گرلز کالج روڈ، اردو بازار چوک اعظم (لیہ) فون **0302-7844094**

اسٹاکسٹ: ادارہ فکر و دانش، الحمد پلازہ، اردو بازار لاہور

انتساب

اپنی شریکِ حیات

ادب دوست

رخسانہ ناہیدؔ

کے نام

حسنِ ترتیب

سہیل ثاقب کے شعوری ارتعاشات (ڈاکٹر صدیق نقوی)	13
لمس ؛ایک زندہ کیفیت کا تاب کشا استعارہ (ناصر ملک)	15
نعتیہ قطعات	20
یوں تو خود اپنی ذات کا مظہر حسین تھے (سلام)	22
فراتِ احمریں کیوں ہے حسین ابن علی (منقبت)	24
ہدیہ تہنیت سرسید احمد خان	26
نذرِ منیر نیازی	27
نذرِ جون ایلیا	29
بنامِ امن یہ بستی کہیں زحمت نہ بن جائے	31
ماں (نظم)	33
دیارِ غیر میں ہر اہلِ انجمن کو سلام	34
سامنا دھوپ کا کرنا ہے تو چھاؤں سے نکل	36
رات میں تھا اور یہی خدشات میرے سامنے	37
کیوں ہوتے بھلا برسرِ پیکار کسی سے	38
فصیلِ ذات کے اس پار تکتا رہتا ہوں	39
ہر اک وجدان سے جو ماورا ہے	41
میں اپنی ذات کے ان دیکھے شہ پاروں سے واقف ہوں	43
ماسوا بندہ و خالق نہیں شامل کوئی	45
در مرا کھٹکھٹا رہی ہے ہوا	47
کدھر کا چین کہاں کا فراغ وحشت میں	50

گنگناتی رہی غزل میری 52
آسرا ہی آسرا موجود ہے 54
نجانے کب کہاں کیسے روش اپنی بدلتا ہے 56
گلشنِ جاں میں خس و خاشاک سے کیا کیا ہوا 58
جس شہر میں ایثار و وفا اور ہی کچھ ہے 60
مرغانِ چمن صحنِ چمن سے نکل گئے 62
لڑکھڑانے لگ گئے جو ایک پیمانے کے بعد 64
جیسے مرے وجود سے حدت نکال لی 66
کبھی میں فن کے لیے تو کبھی سخن کے لیے 68
کوئی محفل نہیں پر میرِ محفل ہو کے بیٹھے ہیں 70
بھٹکتا رہتا ہے تو بھی کہاں کہاں سورج 72
یہ دریا جب کبھی بپھرے سمندر سے الجھتا ہے 74
کیا ہو گیا فرات ترے انتشار کو 75
سچ بولنے کے جرم کا حقدار میں بھی تھا 77
باتیں ہیں سب نصیب کی کیا عشق کیا جمال 78
حسین موسمِ دیدار لے کے آئے ہیں 79
مستی میں لہراتا ہوں خوش رہتا ہوں 80
چلی مغرب سے جو بادِ صبا کچھ اور کہتی ہے 82
اب ایسا بھی مرے یارو گیا گزرا نہیں ہوں میں 83
کہاں لے آئے تم ہمت کا قصہ 84
دکھاؤں گا ترا چہرا مری عادت پرانی ہے 85
اس لیے خود کو بھی رکھا ہے اکیلا اب تک 87
شجر، کانٹے، کلی، گل، سب چمن میں 89
خردمندوں کا کہنا ہے کہ نادانی کا سودا ہے 91
بس اتنا حلقۂ یاراں سے واسطہ رکھا 93
کیوں ہر اک شخص کی آنکھوں میں نمی ہے اب کے 94

کس لیے کس کی طرف کون گیا دیکھتے ہیں 96
عجب تھا یاس کا منظر جو تم نہیں آئے 97
کیمیا گر! کہیں تکمیل میں حد بندی تھی 99
کہاں کی کیسی محبت شراب لے آؤ 101
ہر اک لمحے تری ضد جانے کی اچھی نہیں لگتی 103
غم تھا کسے جو عشق کے رستے عجیب تھے 105
نہ دشمنی ہے کسی سے نہ دوستانہ ہے 107
لفظ مبہم ہی سہی پیار سے کہہ آتا ہوں 109
گھر اپنے میں درد کے چہرے لے آتا ہوں 110
خود بھی عجیب اس کا اثر بھی عجیب ہے 111
تجھے جہاں کی مروت نے مار رکھا ہے 112
سبھی چاکِ گریباں آ گئے کیا 114
مناؤ جشن، کرو سب دھمال، رقص کرو 116
مری وفا پہ بلا کا یقین رکھتے ہو 118
ہاتھ اٹھائے ہیں تو پھر لب پہ دعا ہے یعنی 119
ایک ہی دید میں بے کل مجھے کر دیتا ہے 121
جب ہوا جینا سزا تو خود پہ ہم ہنسنے لگے 122
کوئی تو کام کرنے دے مری جاں 124
کسی سے والہانہ ہو گئی ہے 125
اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے حیرانی کو 127
لو آج اپنی محبت کو عام کرتے ہیں 129
اک عجب سی روشنی ہے پھول پر 131
عشق کا مبتلا کہاں نہ گیا 132
لفظ مانگے تو کبھی اس کے معانی مانگے 134
رت جو مہکی بہل گئے تم بھی 136
مرض بھی لا دوا نہ ہو جائے 138

ترا مجھ پر اجارہ تو نہیں تھا	139
نجانے کس کی انہیں لگ گئی نظر صاحب	141
مہک گلوں کی تو بادِ صبا نہیں ہوتی	142
ہجر ہے، دھوپ ہے صحرا بھی ہے دیوانہ بھی	144
یہ دوستی بھی عجب مرحلوں میں رکھتی ہے	146
ترکِ فراق عجب ہے خوفِ وصال عجب ہے	148
ایک الجھن میں گرفتار ہوں اے یار مرے	150
خدا کا شکر بہت عافیت سے گزری ہے	152
برکت دکھائی دینے لگی اتفاق میں	153
وحشتوں کا کمال موسم ہے	155
حاشیوں سے کبھی مفر نہ کیا	156
ڈوریوں میں گانٹھیں ہیں الجھنیں ہیں بندھن میں	158
محبت جس جگہ نہ ہو میں وہ گھر چھوڑ دیتا ہوں	159
مجھ کو بیگانہ کہا جب کسی سودائی نے	160
دل و نظر میں تماشہ تو روز ہوتا ہے	162
اُسی سے پھر بھی ہمیں آسرا تھا کیوں آخر؟	164
ابھی تو درد کو انبار ہوتے دیکھنا ہے	166
گل و بلبل کلی کوئی تو آئے	168
چشمِ حیرت بنی داستانِ غزل	169
دل سے جب بھی کبھی محبت کی	171
جام بھی تھا ساقی بھی اور رتجگا بھی تھا	173
اُفق کے پار سے یا تُو زمیں کی تہہ سے نکال	175
یوں بھی کیا کہ عشق کا ہر مسئلہ کچھ بھی نہ تھا	176
آئے پیغامِ نظر کوئی حوالہ بن کر	177
بھیجا ہے ترکِ عشق کا اس نے مجھے حساب	179
یہ نئی کوئی واردات ہے کیا	181

ثاقب کتابِ عشق ہے دل سے پڑھا کرو	183
آنکھوں سے کبھی دل میں اترتے ہی نہیں لوگ	185
برا مناتے ہو کیوں ،تم نے کچھ سنا بھی نہیں	187
اس خرابے نے ہمیں زیر وزبر جانا ہے	189
دل جلانا تو کبھی دل کو دکھانا سیکھا	191
خلوتِ عشق کے آداب سمجھنے والے	193
ایک بے چینی سی در آئی مری حشت میں	195
اس سمندر کے لیے دریا نہیں ہونا کبھی	196
بس ایک کمرہ مرا اس میں وحشتوں کا سفر	197
اب تو یارو زندگی کچھ دم کی ہے	199
کبھی نظر میں کبھی دل میں جاگتا ہی رہا	201
مری محرومیوں کو جب ضرورت گھیر لیتی ہے	203
حال پہ بات کر احوال پہ تنقید نہ کر	205
کس لیے اتنی بھلا آہ وفغاں ،جانے دے	206
اپنی دنیا میں ،خیالوں میں جیا کرتے تھے	208
ملیں گے جب وہ تمہیں بام و در اداسی میں	210
تم ستم کرتے ہو کوئی نہ کرم کرتے ہو	212
پا بہ زنجیر کھڑے ہیں ترے دربار میں ہم	214
اک دوسرے سے لگتا ہے بیزار سبھی ہیں	216
ہر کرن آس کی آنکھوں سے چھپا دی گئی کیا	218
میرؔ کے شعر کو سینے سے لگائے ہوئے تم	220
وصل کی امید میں کتنے ستارے جاگتے	222
اب سخن کوئی دل پذیر نہیں	224
بے سبب صدمات کی توصیف کرتے تھک گئے	226
حالِ دل کہہ کر اسے تو اپنے ہی دشمن ہوئے	228
کتنا اکتایا ہوا ہجر کا مارا ہوا میں	230

میں محبت کی کسی ایک کہانی پہ رکوں 232
خواب سے خواب کی تعبیر نہ روکی جائے 233
برا ہو اب کہ اچھا، لکھ رہا ہوں 235
کیا تجھ کو ملا اتنا بتا خواب میں آ کر 237
اپنا انکار بھی اقرار پہ رکھ دیتی ہو 238
کوئی غنچہ کسی دہن میں نہیں 240
کچھ تو بے باکی ضروری ہے پرکھنے کے لیے 242
کبھی یقیں تو کبھی اعتبار بن کے رہا 244
صلیب ودار کا موسم ابھی نہیں آیا 246
بے چہرگی کے دور میں آنکھوں کا کیا شمار 248
کارِ وحشت کا جب سبب نہ رہے 249
خدا کا نام لے اور میرا احتساب نہ کر 250
اپنا قد حسبِ ضرورت میں بڑھا سکتا ہوں 252
پرکھنے کے لیے خود کو، گماں سے نکلو تو 254
اب کے آکاش پہ تارا بھی نہیں دیکھو گے 256
اس کو شبِ وصال میں دیکھا نہیں گیا 258
کبھی تمہاری کبھی اپنی آرزو رکھنا 260
قربت و دوری کو چپ رہ کر بہم کر ہی دیا 262
بدگمانی پہ گر یقیں ہوتا 263
فسانے عشق کے رنج و ملال ہی کے تو ہیں 265
اپنی وحشت سے الجھنے کا ہنر سیکھ لیا 267
بات الفت کی کہاں سود و زیاں تک پہنچی 269
آئے اور میرا دل دکھا جائے 271
بادہ و جامِ مئے، رقصِ شعر و سخن، شام ڈھلنے کو ہے 272
یہ آنکھیں شام کا جب اعتبار کرتی ہیں 274
چاند تاروں کے جو انبار پہ رکھا ہوا ہے 275

جیسے پلِ صراط کو سر کر رہے ہیں ہم 277
محبت کی ہے تو ایسی کوئی تدبیر کرتا جا 279
خوشا کہ عشق کا مطلب بتانے آئے ہیں 281
خوش نصیبی ہے کہ میں اس کی رضا تک آ گیا 283
تجھ سے الفت کا سبب تجھ سے محبت کا سبب 285
خوشا کہ بزم میں سب با کمال بیٹھے ہیں 287
ابھی تو نقل مکانی نہیں ہے سو جاؤ 289
جلال و حشمت و عزت مآب سے باہر 291
خریداروں میں کیوں آخر گنوایا جا رہا ہے 293
وہ بحرِ عشق تھا جس کا کنارہ ہو بھی سکتا تھا 294
مجھے ہر کوئی مجھ سا لگ رہا ہے 296
دکھ میں اب ہم کو دلاسا بھی نہیں ہے کوئی 298
یعنی ہر اک نظر سے محبت چلی گئی 300
رات شبنم نے بھگو ڈالے شجر جتنے تھے 302
دل میں اک حسرتِ نایاب لیے بیٹھے ہیں 304
اب کوئی بارِ دگر ہم سے نہیں ہو سکتا 306
ہست کا کیا ہے بھلا اور بھلا بُود کا کیا 308
دکھائی دیتا نہیں پھر بھی ہر چمن میں رہے 309
میں خشک پتہ ہوا میں، شجر میں ہوں ہی نہیں 311
یہ زُعم کس کے لیے ہے فتور کس کے لیے 313
قدم جمائے کھڑے تھے جو یاں گرانی میں 314
نہ سوال میں نہ جواب میں کہیں کھو گیا 315
یہ زعم کس کے لیئے ہے فتور کس کے لیے 316
میں اپنے آپ سے بیزار کر دیا گیا ہوں 317
شوقِ تعمیر میں بس حرف کی دلداری کی 318
بلا رہا ہے کسی دائمی اذیت کو 319

سہیل ثاقب کے شعوری ارتعاشات

سہیل ثاقبؔ کی شاعری میں انوکھا اوراَن چھوا لہجہ نئے جہانوں کی سیر کراتا ہے۔مضامین کے حوالے سے معنوی اکائیوں میں ایسے کامل تجربے اپنے جلوے بکھیرتے ہیں جن کے احساس وتاثر میں شامل ہو کر قاری پر ایک جذب کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اوراسی کیفیت کے دوران وہ بصیرتِ باطنی کے توسط سے شعوری ارتعاشات سے بھی گزرتا ہے اور پورے وجود سے تفہیمی عمل کو اپناتا ہے۔

ثاقبؔ نے اپنی غزلوں میں داخلی تجربات اورکیفیات کو خارجی مظاہر وعوامل سے وابستہ کرتے ہوئے اظہار کی صورت کو جہاں بیانیہ انداز عطا کیا ہے وہیں پیکر تراشی کے ذریعے بھی نئے تصوّرات کی پیش کشی کو اپنا وطیرہ بنالیا ہے۔اُن کی غزلوں کے اشعار میں مصرعوں کا ربط ورشتہ اتنا مضبوط ہوتا ہے کہ کسی بھی مضمون کی ادائیگی میں تشنگی کا احساس باقی نہیں رہتا۔ردیف وقوافی کے استعمال میں ثاقبؔ کو کمال حاصل ہے کہ اُن کی غزلیں طویل بحروں کو اختیار کرنے اور ردیف وقوافی کے ایک بڑے حصّے کو اپنے دامن میں جگہ دینے کے باوجود معنوی چستی کو برقرار رکھتی ہیں۔ثاقبؔ کی غزلوں میں لفظوں کی دروبست سے فطری روانی کا احساس بیدار ہوتا ہے اور ہر لفظ اپنی جگہ اپنی

قدر و قیمت اور اہمیت کا نقش چھوڑ جاتا ہے۔

ثاقبؔ کی لفظیات قدیم روایتی شاعری کے ڈکشن سے قریب ہے تاہم اسی لفظیات سے انہوں نے نئی تخلیقی فضا قائم کی ہے اور حسّی تجربوں کو ایک نیا رنگ و آہنگ بخشا ہے۔ اُن کی غزلوں کی بعض بحروں میں لچکتا ہوا آہنگ وجد اور سرشاری سے ہمکنار کرتا ہے مگر ایسی حالت میں بھی معنوی اکائی کو آہنگ کے ساتھ باندھ کر رکھنے کی خوبی ثاقبؔ کی فطری تخلیقی صلاحیتوں کا بنیادی وصف ہے۔ ثاقبؔ کی شاعری میں تراکیب کا استعمال روایتی شاعری کی خوشبو سے لبریز ہو کر شعری کیفیت کو معطّر کر دیتا ہے اور غیر مانوس اور بیگانہ روش سے ہٹ کر فطری پن کی دلیل پیش کرتا ہے۔ ثاقبؔ نے موضوعاتی غزلیں لکھ کر بھی اپنے ہنر کا ثبوت پیش کیا ہے اور فکری توانائی سے سوچ کے نئے زاویے تراشے ہیں۔ ثاقبؔ کی شاعری میں داخلی کیفیات جس شدّت سے اپنے رنگ بکھیرتی ہیں وہیں خارجی حالات کی عصری معنویت بھی اُن کی شاعری کو خاص منصب عطا کرتی ہے اور سیاست کی بازی گری سے لے کر کرداروں کے ادھورے پن تک کی کہانی سناتی ہے۔

ثاقبؔ کے شعری کائینات میں درد و کرب کی گرم لو چلتی ہے اور زندگی کو صحرا نورد بنا دیتی ہے مگر اس سے شاعر کی آرزوئیں مضمحل نہیں ہوتیں بلکہ اس کی حوصلہ مندی اور مستقل مزاجی اُسے ہر قسم کی تمازت میں تپنے کے باوجود راحت بھرے لمحات کا یقین دلاتی ہے اور یہ یقین ہی ثاقبؔ کی شاعری کو حوصلہ مند شعری رُجحان کا منفرد و مخصوص منصب عطا کرتا ہے۔

ڈاکٹر محمد صدیق نقوی

ادونی، آندھرا پردیش (انڈیا)

لمس؛ ایک زندہ کیفیت کا تاب کشا استعارہ

ہجر سے شبِ وعدہ، اعتبار ملنے کا
خواب ہی تو ہے جاناں
لمس کی حقیقت کو خواب ہی تو ہونا ہے
وصل زندگی ہے گر لمس آخری لمحہ
شوخیِٔ مراسم کا لمس تجزیہ بھی ہے
شبدِ گفتگوؤں کے، اعتبار ملنے کا
ضابطے وفاؤں کے، ضابطے جدائی کے
سرحدوں میں رہتے ہیں
سرحدوں کے باہر تو لمس کا علاقہ ہے
لمس بادشاہی کا عصر تا قیامت ہے
لمس جاگتی سانسوں کی شبِ غریباں میں
آخری اجازت ہے
لمس معجزہ بھی ہے

یہ چند سطریں (نظم) قرطاس پر پھیلے ہوئے اس **لمس** سے چرائی گئی ہیں جس کی آبیاری

سہیل ثاقب نے چشمِ ترسے کی اور دشتِ جنوں کی مہیب وسعت پر آشکار کی۔ **لَمس** آنکھ سے وابستہ ایک تحرک ہے۔ **لَمس** ہونٹوں سے منسلک ایک جنوں ہے۔ **لَمس** کسی پھوٹتے ہوئے نور کا انگلیوں کی پوروں سے جُڑا ہوا ایک رشتہ ہے۔ **لَمس** ذہن میں پروردہ ایک کیفیت کا عنوان ہے جو لحظہ بھر کی واردات کو بساطِ عمر کے پس منظر میں تاحدِنگاہ پھیلے ہوئے خلاکو ست رنگی کرنوں سے معمور کردیتی ہے۔ **لَمس** اپنی نوع میں ایک مکمل روئیداد ہے جس کے سبھی کردار اس کے اپنے تخلیق کردہ ہیں، سکرپٹ اپنا لکھا ہوا ہے اور وقت کا تعین بھی اس کی مرضی کے تابع ہوتا ہے۔ اسی منہ زور **لَمس** کو قرطاس پر انگلیوں کی متاثرہ پوروں سے سہیل ثاقب نے رقم کیا ہے۔ شوریدہ سری کیا؟ آشفتہ سری کیا؟ تہہ در تہہ کھلتی ہوئی تشنگی کیا؟ باتیں تو سب کرتے ہیں۔ اچھی باتیں کرتے ہیں۔ سہیل ثاقب کے مجموعہ کلام میں بھی سیکڑوں اچھی باتیں ہیں۔ ان باتوں میں لمس کا گداز ہے، تعبیر کی خوشبو ہے اور استزادیہ کہ سمجھ میں آنے والی باتیں ہیں۔ وہ زمین سے جُڑا ہوا شاعر ہے۔ تبھی زمینی باتیں کرتا ہے۔ آکاش کی طرف دیکھتا ضرور ہے، زیرِلب مانگتا بھی ہے مگر اس کا مخاطب زمینی حقائق ہوتے ہیں جو اسے لکھنے پر مائل کرتے ہیں۔

سہل ممتنع اس کا خاص ہتھیار ہے۔ آسان پیرائے میں بڑی بات کہہ جانا اسے مرغوب ہے۔ غزل اس کا شوق ہے۔ مذہبی پس منظر اس کے ہنر میں رچا ہوا ہے۔ حمد کہتا ہے تو اپنے ساتھ ساتھ قلم کو بھی جھکا دیتا ہے۔ نعت کہتا ہے تو اس کے روم روم میں عقیدت اور سرشاری بھر جاتی ہے۔

مربوط کائنات ہے یہ اُن کے نام سے
پڑھتے رہو درود بہت احترام سے

وہ اس دنیادار عصر میں رہتے ہوئے دنیادار نہیں ہے۔ وضع دار ہے۔ اس کی شخصیت کی تعمیر اس قدر معصوم بنیادوں پر ہوئی ہے کہ اسے ملنے والا انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔ جتنا اچھا لکھتا ہے، اتنا ہی اچھا بولتا ہے۔ اس کی گفتگو چھوٹے چھوٹے جملوں پر استوار ہوتی ہے۔ سیدھی سادی سی۔ نہ کوئی تصنع، نہ بناوٹ۔ چند ایک مشاعروں میں اُسے سننے کا بھی اتفاق ہوا۔ دھڑکنیں تھام لینے کے ہنر

سے آراستہ آواز پنڈال میں سماں باندھ دیتی ہے۔مذاق سے بھی محبت کے پہلو تراشنا اس کا اضافی ہنر ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی زندگی، اپنے معمولات اور اپنے دوستوں سے مطمئن رہتا ہے۔

اُس کے ہاں قدیم اور روایتی شاعری نئے اور جدید ڈکشن میں میسر ہے۔غزل کی بحر سے لے کر آراستہ ہر لفظ اُس کے داخلی و خارجی چناؤ کو داد دیتا ہوا ملتا ہے۔اُس کا آہنگ،اسلوب اور اندازِ بیاں ایک خاص سمت اختیار کر چکا ہے اور بجا طور پر اس کی پہچان بن چکا ہے۔وہ اپنی تخلیقی فضا میں رہتے ہوئے خوبصورت الفاظ وتراکیب کی مدد سے معاشرت، ہجر و وصال، آرزو، سیاست، عوامی کج روی، بے حسی اور انسانی بے بسی جیسے تلخ و حساس موضوعات پر سیر حاصل گفتگو کرتا ہے۔وہ انسانی فطرت اور جبلت کو بھی موضوعِ سخن بناتا ہے اور فکری توانائی سے نئے کردار سینچتا ہوا داخلی اور خارجی کیفیات پر رقم طراز ہوتا ہے۔اُس کے ہاں شکوہ وشکایت کا روایتی انداز بھی موجود ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

میرے گُنہ لکھے گئے نہ پوچھ کچھ ہوئی کوئی
میں بھی تھا حشر میں مگر میری نہیں سنی گئی

وہ دیارِ غیر میں رہتا ہے مگر اپنے وطن سے دور اور لاتعلق نہیں ہوتا۔ پاکستان کے گلی کوچوں میں اس کا تخیل محوِ نظارہ رہتا ہے۔تبھی وہ بھی ہم عصر شعرا کی طرح اپنے ہم وطن عوام کی زبوں حالی کا ذمہ دار وطن پر مسلط حکمرانوں کو قرار دیتا ہے اور کراہ اٹھتا ہے:

حاکمِ وقت نے کس سادہ دلی سے یہ کہا
لے کے آتا ہی نہیں اپنے مسائل کوئی

اُس کے اندر ایک بہت بڑا خلا واقع ہے جو عہدِ ماضی کی ایک ہجرت کے سبب پیدا ہوا تھا۔معاشی گھن چکر نے اُسے پاکستان سے سعودی عرب منتقل کر دیا اور وہ اچانک اُس تمام گردوپیش سے کٹ گیا جس نے اس کی شخصیت کی تعمیر کی تھی۔یہ خلا کسی مقناطیس کی طرح بار بار اسے اپنی جانب کھینچتا ہے اور کچھ لکھنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ایسی ہی کیفیت سے دوچار ہوتے ہوئے اس

نے **لمس** میں وطنِ مالوف سے اپنی محبت کی بے ساختگی میں کہا:

جو ہجرت کر گئے اُن کو چمن آواز دیتا ہے
بہت مشکل میں اس پل ہے، وطن آواز دیتا ہے
سنو اس کی صدائے خونچکاں اور پھر بڑھو آگے
یہ لاغر لڑکھڑاتا سا بدن آواز دیتا ہے

ہجرتوں سے یہی سوغات ملی ہے مجھ کو
آج تک مجھ کو پتہ میرے ٹھکانے کا نہیں

ابھی پچھلا سفر باقی ہے میرا
تو کیوں پھر سے نئی ہجرت کا قصہ

ہر ایک صبح مسافت نئی بلائے ہمیں
یہ روز روز کی ہجرت نے مار رکھا ہے

گھر سے ہجرت کا چلو وقت قریب آیا ہے
مجھ سے اکتانے لگے ہیں در و دیوار مرے
بس چل پڑو کسی بھی طرف حوصلوں کے ساتھ
ہجرت کا سوچنا ہے تو رستوں کا کیا شمار

ہجر و فراق کی جہاں روایت سہیل ثاقب کی شاعری میں جا بجا ملتی ہے، وہیں وہ روایتی انداز میں اپنی ہویت کے سربستہ راز کو بھی کریدنے کی جہت میں مگن دکھائی دیتا ہے۔ غالب و میر کو جہاں پیش روئے سخن سمجھتا ہے، وہیں ان کی تقلید میں چند گام چلتا ہے اور اس پر احساسِ تفاخر محسوس کرتا ہے۔ کہتا ہے:

یہ فرشتوں کے گماں میں بھی نہ آیا تھا کبھی
کچھ نہ ہونا تھا مگر اس خاک سے کیا کیا ہوا

سہیل ثاقب کی شاعری اپنے قاری سے ہم کلام ہونے کے وصف سے آراستہ ہے۔ یہ بتاتی ہے کہ رہ گزر دشتِ جنوں تھی، نہ رہی۔ زندگی فریبِ آرزو تھی، نہ رہی۔ بخت چند گام ہم سفر تھا، نہ رہا۔ وقت بھی سایہ کشا تھا، نہ رہا۔ اور رہا، تو رہا بھی کیا، چند آہیں ۔۔۔ چند بکھری ہوئی خاکستر یادیں اور چند دھندلے نقوش ۔۔۔ جن سے بقیہ عمر کیلئے محض بہلاوے، جواز اور اصول ہی وضع کیے جا سکتے ہیں اور ہر وضع کی ہوئی کیفیت تکلیف رساں ہوتی ہے۔ بے ساختگی کی موج انگیز سطوت ہم سفر نہیں رہتی۔ ادھورے پن کا احساس ہر آن بڑھتا جاتا ہے۔ محرومیاں ایسا شہر بسائے چلی جاتی ہیں جہاں تشنہ آرزوؤں، نا تعبیر یافتہ خواب، سسکیاں اور پُر فریب ہیولے ہی رہ سکتے ہیں۔ ذی نفس کوئی نہیں ۔۔۔ ذی نفس کوئی نہیں ۔۔۔ اور ذی نفس تو بس حدتِ لمس پر پلتا ہے۔ اور ذی نفس تو بس شوقِ لمس سے ہی نمو پاتا ہے۔ اور ذی نفس تو بس تابِ لمس کا ہی طالب ہوتا ہے۔

یقین ہے کہ سہیل ثاقب کا مجموعہ کلام **لمس** اپنی نوع کا منفرد مجموعہ ثابت ہوگا جو اپنے شاعر کے حقیقی مقام کو آشکار کرتے ہوئے طشت از بام ہوگا۔ دعا ہے کہ زورِ قلم اور زیادہ ہو اور قیمتی تخلیقات کا یہ سلسلہ جاری رہے۔ آمین

ناصر ملک
(ایڈیٹر "اردو سخن ڈاٹ کام" پاکستان)

نبی کے عشق کی تضمین لکھنا چاہتا ہوں
درود پڑھ کے میں یاسین لکھنا چاہتا ہوں

درِ نبی پہ جو مانگی ہیں ان دعاؤں پر
میں اپنی آنکھوں سے آمین لکھنا چاہتا ہوں

درودِ سیدِ عالم سجا کے ہونٹوں پر
پریشاں حال ہوں تسکین لکھنا چاہتا ہوں

خدایا روک لے مجھ کو یہیں مدینے میں
میں ذرے ذرے پہ تحسین لکھنا چاہتا ہوں

کس عقیدت سے منائی گئی ہے شانِ نبی
کس محبت سے چلے مل کے سبھی دل والے

بس دعا کرتا ہوں ثاقبؔ کہ ہمیشہ کے لیے
کوئی دشمن نہ کہیں راہ میں نفرت ڈالے

مربوط کائنات ہے یہ اُن کے نام سے
پڑھتے رہو درود بہت احترام سے

بس منتظر ہوں اپنے بلاوے کا آپ تک
آؤں گا حاضری کو بڑے اہتمام سے

یوں تو خود اپنی ذات کا مظہر حسین تھے
اک فرد نہیں بارِ مکرر حسین تھے

آبِ فرات تیری بھلا کیا بساط ہے
تشنہ بھی ہو کے دیکھ سمندر حسین تھے

کیا شب تھی وہ کہ جس میں ہوئی نور کی بارش
گل ہو گئے چراغ تو گھر گھر حسین تھے

تنہا سمجھ رہا تھا جنہیں شمر جنگ میں
دیکھا نظر اٹھا کے تو لشکر حسین تھے

نیزے پہ بولتی ہوئی تہذیب کیا لکھوں
فرقان تھا سخن تو سخنور حسین تھے

گر ختم شجاعت تھی علی بوتراب پر
دشتِ بلا میں صبر کا پیکر حسین تھے

وہ نازِ کائنات میں فخرِ زمیں سہیلؔ
کربل میں آسمان کا شہ پَر حسین تھے

فرات احمریں کیوں ہے حسین ابن علی
یہ آپؑ کا ہی تو خوں ہے حسین ابن علی

ازل سے تا بہ ابد ہر کوئی کہے گا یہی
منالِ ضبط و جنوں ہے حسین ابن علی

یزید بھول گیا تھا کھلی حقیقت کو
کہ چھت رسول، ستوں ہے حسین ابن علی

زمین سرخ جو بے حس رہی تو کیا غم ہے
یہ آسماں تو نگوں ہے حسین ابن علی

بہ وصفِ میتِ کربل بہ تشنہ موجِ فرات
پیامِ صبر فزوں ہے حسین ابن علی

ردائیں بچ گئیں احکامِ بارگاہی سے
سو اب سکوں ہی سکوں ہے حسین ابن علی

زمیں تو کچھ بھی نہیں ایسے نام کے آگے
اس آسماں کا جنوں ہے حسین ابن علی

ہدیۂ تہنیت سر سید احمد خان

سر چشمۂ دانائی کی مسند تجھے سلام
اے منبعِ تہذیب کے جید تجھے سلام

اے صاحبِ ادراک و ہنر، خضرِ آگہی
اے کہکشانِ علم کے گنبد تجھے سلام

اے فخرِ علیگڑھ تو مدبر تو مبلغ
ہم دشت نوردوں کا بھی سید تجھے سلام

تا حشر ترا نام جو تاریخ لکھے گی
اے دانش علیگ کے سرمد تجھے سلام

ہم تھے ہی بدنصیب تجھے سن نہیں سکے
زندانِ بے نوا کے مقید تجھے سلام

نذرِ منیر نیازی

مصورِ جمال تھا منیرؔ جس کا نام تھا
وہ شخص باکمال تھا منیرؔ جس کا نام تھا

مجال کیا نگاہِ بد اٹھا سکے کوئی کبھی
ادب کی ایک ڈھال تھا منیرؔ جس کا نام تھا

ہر اک کا دوست تھا مگر تھا اجنبی وہ ذات میں
عجیب سا سوال تھا منیرؔ جس کا نام تھا

سخن کے دشت میں تو ساری رونقیں اسی سے تھیں
وہ کیا حسیں غزال تھا منیرؔ جس کا نام تھا

کہاں سے لائیں دوسرا کوئی سخن شناس اب
خود اپنی ہی مثال تھا منیرؔ جس کا نام تھا

وہ منزلِ عروج پر تو آ گیا تھا شان سے
مگر بہت نڈھال تھا منیرؔ جس کا نام تھا

جو زندگی سے روٹھ کر سہیلؔ اب چلا گیا
وہ یارِ بے مثال تھا منیرؔ جس کا نام تھا

صلیبِ حق پہ جب لایا گیا تو
صداقت کا حوالہ بن گیا میں
مرے بیٹے نے جب چلنے کا سوچا
نئی دنیا کا رستا بن گیا میں

نذرِ جون ایلیا

مشق سخن کے نام پر مشق سخنوری گئی
پہلے تو وہ چلی گئی تھی اب کے شاعری گئی

میرے گُنہ لکھے گئے نہ پوچھ کچھ ہوئی کوئی
میں بھی تھا حشر میں مگر میری نہیں سنی گئی

اب لطفِ خاص بھی نہیں اب لطفِ عام بھی نہیں
وہ کیا گئی خیال سے جیسے کہ زندگی گئی

دماغ سے تھی ماورا نہ دل سے اپنے دور تھی
تو کیسے دسترس سے پھر تمھاری بندگی گئی

جیسے ورق پلٹ دیے سنے پڑھے بغیر سب
بادِ نسیم آئی تھی آ کر یونہی چلی گئی

ترکِ تعلقات کا اک یہ سبب بھی ہے ضرور
ہم نے جو بات بھی کہی تم سے نہیں سنی گئی

یعنی کہ سب ہی کھو گئے یعنی کہ سب چلے گئے
اس برہمی کی خیر ہو ہم سے تو دوستی گئی

شاید تمام ہو گئے طے مرحلے وفاؤں کے
اُس وحشتِ سفر کے ساتھ سا تھ بے کلی گئی

نہ لکھنو بھی وہ رہا ، دلی بھی وہ نہیں رہی
غالب چلے گئے تو پھر شعروں کی چاشنی گئی

بنامِ امن یہ بستی کہیں زحمت نہ بن جائے
کہیں پھر کربلا تیری مری قسمت نہ بن جائے

کئی فرعون تجھ سے پہلے بھی تاریخ میں گزرے
کہیں تُو بھی زمانے کے لیے عبرت نہ بن جائے

ہر اک سے فاصلہ رکھنا ہی بہتر ہے یہاں اب تو
مجھے ڈر ہے، شناسائی کہیں الفت نہ بن جائے

میں اپنے اشک بھی اب آنکھ سے گرنے نہیں دیتا
مری کوئی بھی کمزوری تری طاقت نہ بن جائے

یہ بہتر ہے کہ گاہے آئنہ دیکھا کرو صاحب
اچانک سامنا خود سے کہیں حیرت نہ بن جائے

میں اپنے آپ سے اب دور رہتا ہوں اسی ڈر سے
کہیں تجھ سے بچھڑ جانے کی یہ صورت نہ بن جائے

دریچے گھر کے اپنے اس لیے رکھتا ہوں وا ثاقبؔ
مجھے ڈر ہے کہ تنہائی مری وحشت نہ بن جائے

کوئی شکوہ نہیں زمانے سے
لطف دوری میں جب ہے قربت کا
تم بھی ماری ہوئی ہو الفت کی
میں بھی ہارا ہوا محبت کا

ماں

کب تلک رکھوں بتا یہ بھیس ، ماں
ہوں دکھوں سے آج تک میں لیس، ماں

گر اجازت ہو تو لوٹ آؤں وطن
عمر میری کھا گیا پردیس ماں

ماں! میں رہ سکتا نہیں تیرے بغیر
میرا رستہ دیکھتا ہے دیس ماں

دیارِ غیر میں ہر اہلِ انجمن کو سلام
چلو یہ مل کے کہیں سب کہ اس چمن کو سلام

سلام ارضِ وطن تیرے بانکپن کو سلام
جو لائے روشنی ایسی کرن کرن کو سلام

یہ سبز رنگ تو پہچان ہے، یہ جان بھی ہے
ترے جمال پہ قرباں، ترے بدن کو سلام

یہاں سے رزق ملا کرتا ہے غریبوں کو
ترے پہاڑ، ترے کھیت تیرے بن کو سلام

سلام خطۂ کشمیر کے ہر اک گل کو
جو مدتوں سے دلوں میں ہے اس لگن کو سلام

حصارِ شب سے اجالے نکالنے کے لیے
جو ساتھ ساتھ رہا ایسے ہر سجن کو سلام

جسے بھی دیکھو تجھے نوچتا ہی رہتا ہے
ترے بلکتے سسکتے ہوئے بدن کو سلام

تری بقا کے لیے جان بھی نچھاور رہے
جو تیرے نام پہ پہنا ہے اس کفن کو سلام

سجے گا جذبۂ ایماں سے ایک دن تو بھی
ہر ایک بولے گا کہ ایسے گلبدن کو سلام

سامنا دھوپ کا کرنا ہے تو چھاؤں سے نکل
اے سفر تو مری قسمت ہے تو پاؤں سے نکل

ذہن کے کھول دریچے کہ کوئی آمد ہو
زندہ رہنا ہے تو پھر خواب سراؤں سے نکل

پھر برسنے کا بھی ساون تجھے حق ہے لیکن
اُس کو چھونے کے لیے پہلے گھٹاؤں سے نکل

ترا دشمن کہیں ہو جائے نہ سورج کا وجود
سامنے آ ذرا، دیوار کی چھاؤں سے نکل

منتظر ہے ترا شہپر تری پروازوں کا
تجھ کو اُڑنا ہے تو پھر دھیمی ہواؤں سے نکل

پھر کبھی لوٹ کے میں گھر نہیں جانے پایا
ماں نے اک بار کہا تھا کہ تو گاؤں سے نکل

رات میں تھا اور یہی خدشات میرے سامنے
صبح کیا ہوں شہر کے حالات میرے سامنے

جھلملاتے جا رہے تھے ہجر میں جلتے دیے
ڈھل رہی تھی دھیرے دھیرے رات میرے سامنے

شوق تھا کچھ پل گزاروں ساتھ میں اپنے کبھی
زندگی لے آئی ترجیحات میرے سامنے

میں یہ سمجھا وصل کے لمحے رہیں گے دیر تک
وقت کی چلتی رہی بارات میرے سامنے

تم مقاماتِ فقیراں سے ابھی واقف نہیں
دست بستہ رہتے ہیں جنات میرے سامنے

صبح تک ساری سزائیں ہی بدل کے رہ گئیں
فیصلہ کچھ اور ہی تھا رات میرے سامنے

کیوں ہوتے بھلا بر سرِ پیکار کسی سے
کم ہم نے رکھی جان کے رفتار کسی سے

تم آئے کہاں سے ہو کہاں جاؤ گے آخر
کیوں پوچھتا ہے سایۂ دیوار کسی سے

کچھ ترکِ وفا کا بھی سبب ہو گا یقیناً
تحفے میں تو ملتا نہیں آزار کسی سے

سوچو تو یہ دیوانگی کچھ بھی نہیں لیکن
پوچھو تو کبھی جا کے سرِ دار کسی سے

آئے گا کوئی ساتھ نبھانے تو مرا بھی
اُمید یہی رکھتا ہوں ہر بار کسی سے

کب ہم میں نہ تھا ضبط کا یارا کبھی ثاقبؔ
کب ہم ہوئے ہیں عشق میں بیزار کسی سے

فصیلِ ذات کے اس پار تکتا رہتا ہوں
میں خضرِ راہ ہوں پھر بھی بھٹکتا رہتا ہوں

کہیں تُو چھوڑ کے سورج چلا نہ جائے مجھے
جبھی تو ساتھ ترے میں سرکتا رہتا ہوں

یہ وقت مجھ کو مری زندگی کے ساغر میں
ہلاتا رہتا ہے اور میں چھلکتا رہتا ہوں

سوالِ ہجر ہے کوئی نہ وصل کا قصہ
مگر یہ کیا کہ میں پلکیں جھپکتا رہتا ہوں

خزاں نے شاخِ تمنا کو بانجھ کر دیا ہے
مگر یہ زُعم کہ اب بھی لہکتا رہتا ہوں

ہر ایک خواب ابھی دسترس میں ہے میری
میں پھر بھی اُن سے کیوں اتنا جھجکتا رہتا ہوں

اسی لیے تو سرِ شام ڈوب جاتا ہے
اُسے گلہ ہے کہ میں کیوں دمکتا رہتا ہوں

مرا نسب ہے محبت تو عشق مسلک ہے
نہ جانے کتنے دلوں میں دھڑکتا رہتا ہوں

تمہارا کام تبسم ہے میرا نام سہیلؔ
تم ہنستی رہتی ہو اور میں چمکتا رہتا ہوں

ہر اک وجدان سے جو ماورا ہے
دریں چہ شک وہی اپنا خدا ہے

سرِ امکاں عجب اک مرحلہ سا
ردائے نیل ہے یا اک خَلا ہے

کوئی تشکیک کا عنصر ہے اس میں
سمندر سے تعفن اُٹھ رہا ہے

سخن کے ماہ پارو کچھ تو بولو
اندھیرا ذہن میں پھیلا ہوا ہے

شکستِ زندگی کی ہے علامت
یہ کہنا جو ہوا اچھا ہوا ہے

کہاں تک چشمِ حیرت وا رہے گی
تجسس صبر پر میرے خفا ہے

سنو آزردگاں جاتے کہاں ہو
درِ اقدس ہی تو دارالشفا ہے

عقیدت میں جبیں جھکنے لگی ہے
ذرا دیکھو یہ کس کا نقشِ پا ہے

جو نا ممکن ہو وہ ممکن ہو کیسے
ڈھلانوں پر کبھی پانی رکا ہے؟

یہاں بے چہرگی کا ذکر کیسا
ہر اک چہرے پہ اک چہرہ سجا ہے

چلو صحرا میں ہی خیمے لگائیں
کہ اب ان بستیوں میں کیا رکھا ہے

کئی دل ٹوٹتے ہیں روز ثاقبؔ
ترا قصہ کوئی قصہ نیا ہے

میں اپنی ذات کے ان دیکھے شہ پاروں سے واقف ہوں
جہاں سایا نہ ٹھہرے ایسی دیواروں سے واقف ہوں

سخن کے اس سفر میں کیوں کسی سے خوف ہو مجھ کو
کہ میں اس رہ گزر کے سارے بنجاروں سے واقف ہوں

مجھے بھی آتا ہے فن اپنی منزل ڈھونڈ لینے کا
جو رستہ روک لیں میں ایسے کہساروں سے واقف ہوں

وہ کتنا ظرف رکھتے ہیں مجھے سب علم ہے ساقی
ترے میخانے کے میں سارے میخواروں سے واقف ہوں

یہاں تو بے طلب کوئی کسی سے بھی نہیں ملتا
زمانہ ساز دنیا کے اداکاروں سے واقف ہوں

فقیروں کو بھلا کیا دے گا بس تُو جان لے اتنا
ترے جیسے نہ جانے کتنے زرداروں سے واقف ہوں

سخن ور ہوں، سخن کی وادیوں سے لفظ لاتا ہوں
میں اس رستے میں حائل اونچی دیواروں سے واقف ہوں

میں اک پل میں نتیجہ جنگ کا سب کو بتا دوں گا
شکست و فتح کے ثاقبؔ میں نقّاروں سے واقف ہوں

ماسوا بندہ و خالق نہیں شامل کوئی
رزق اور موت میں ہوتا نہیں حائل کوئی

پھر مرے ذہن میں اک خوف سا کیوں رہتا ہے
ہے عقب میں کوئی مرے نہ مقابل کوئی

حاکمِ وقت نے کس سادہ دلی سے یہ کہا
لے کے آتا ہی نہیں اپنے مسائل کوئی

زندگی اس لیے میں ساتھ تجھے رکھتا ہوں
منتظر تیرے لیے ہے کہیں منزل کوئی

گھر کی دیواریں بھی کیا بہری ہوئی جاتی ہیں
اب سرِ حال نہ جھنکار نہ پائل کوئی

یہ زمیں کیا ہے فلک تک بھی دہل جاتا ہے
ٹوٹتے دیکھا نہیں تم نے ابھی دل کوئی

دشتِ غربت کے مکینوں کو یہی کافی ہے
بزم کوئی کہیں برپا ہو یا محفل کوئی

اتنے دکھ جھیلے ہیں ہر شخص نے تیرے ہوتے
زندگی تیری طرف اب نہیں مائل کوئی

ہر سفر پہلی مسافت کا تسلسل نکلا
عمر بھر ہم سے گریزاں رہی منزل کوئی

اس طرح مانگتا ہوں گھر سے اُجالے ثاقبؔ
جیسے صحرا میں صدا دیتا ہو سائل کوئی

در مرا کھٹکھٹا رہی ہے ہوا
شام ہی سے ڈرا رہی ہے ہوا

کیا کوئی شہر جلنے والا ہے
آج پھر مسکرا رہی ہے ہوا

میرے پیروں کی دھول کو چھونے
اپنے قد کو گھٹا رہی ہے ہوا

خانۂ وقت میں مقید ہوں
مری وحشت کو کھا رہی ہے ہوا

ہر قدم پھونک پھونک کے رکھنا
نقشِ ہستی مٹا رہی ہے ہوا

دشت میں اُڑ رہے ہیں کچھ پتے
کس کے گلشن سے آ رہی ہے ہوا

میری تنہائی بانٹنے کے لیے
بارِ وحشت اُٹھا رہی ہے ہوا

اب مرے ساتھ چلتی ہے
کل تلک جو خفا رہی ہے ہوا

میرے گھر میں کوئی دریچہ نہیں
پھر کہاں سے یہ آ رہی ہے ہوا

لَو کے اطراف میں تلاطم ہے
دیکھ لو جھلملا رہی ہے ہوا

آئینہ لائے خد و خال نئے
تازہ تازہ سی آ رہی ہے ہوا

اب حوالے بھی معتبر نہ رہے
جاتے جاتے بتا رہی ہے ہوا

جن چراغوں میں دم نہیں ثاقبؔ
اُن کو پھر کیوں جلا رہی ہے ہوا

ابھی ہمیں کسی منزل کی جستجو ہے کہاں
ابھی تو رہبری اندھے کنویں میں اتری ہے

کدھر کا چین کہاں کا فراغ وحشت میں
حضور ایک سے ہیں دشت و راغ وحشت میں

کہیں سمجھ میں تو آنے نہیں لگی دنیا
جو تو بھی ہونے لگا باغ باغ وحشت میں

دھواں بھی بین کی صورت سروں پہ چھانے لگا
نہ جانے کس نے جلائے چراغ وحشت میں

یہ کون لوگ ہیں دشتِ جنوں کے رستے پر
لگانے نکلے ہیں اپنا سراغ وحشت میں

میں خود کو باتوں میں کب تک لگائے رکھوں گا
کھنکتے بھی تو نہیں ہیں ایاغ وحشت میں

عجیب ہجر میں شب بھر تھی مبتلا آنکھیں
کہ جھلملاتے رہے تھے چراغ وحشت میں

یہ لوگ فردا کے سورج کہاں تلاش کریں
غروب ہو گئے سب دل کے داغ وحشت میں

ہراس، خوف، گماں، ڈر، جنوں کی بات کرو
نشہ کہاں کا کدھر کے ایاغ وحشت میں

تراش موم کے پیکر مگر یہ دھیان رہے
جلا نہ دیں کہیں ان کو دماغ وحشت میں

لو ہم نے چھوڑ دیا اہلِ دید پر قصہ
یہ سارے مور کیوں لگتے ہیں زاغ وحشت میں؟

گنگناتی رہی غزل میری
اُس کو گاتی رہی غزل میری

چشمِ حیرت تھی یا وہ چشمِ خمار
ڈگمگاتی رہی غزل میری

اُس کے ہاتھوں میں چوڑیوں کی طرح
کھنکھناتی رہی غزل میری

میرے لہجے سے اُس کی آنکھوں تک
آتی جاتی رہی غزل میری

لکھ رہا تھا میں اس کی آنکھوں پر
اور گاتی رہی غزل میری

کشتِ دل پر بہار کی صورت
لہلہاتی رہی غزل میری

دھیرے دھیرے کسی کے دل میں مرا
گھر بناتی رہی غزل میری

اک معمہ تھا دل لگانا بھی
ڈگمگاتی رہی غزل میری

اُس کے ہونٹوں کی تھرتھراہٹ سے
کپکپاتی رہی غزل میری

دکھ تو اس بات کا تھا اے ثاقبؔ
دل دکھاتی رہی غزل میری

آسرا ہی آسرا موجود ہے
جس طرف دیکھو خدا موجود ہے

عہدِ حاضر کے یزیدوں کے لیے
ہر گلی میں کربلا موجود ہے

آس تو ٹوٹی نہیں ہے آج تک
ہم میں اب بھی حوصلہ موجود ہے

ماں نے جینے کی دعا دی، جی اُٹھے
اس کا مطلب معجزہ موجود ہے

کیوں بھٹکتے پھرتے ہو چاروں طرف
جھانک لو دل میں خدا موجود ہے

دیکھنے والی نگاہیں چاہئیں
ہر قدم پر آئینہ موجود ہے

موجِ دریا میں محبت بہہ گئی
سطح پہ ٹوٹا گھڑا موجود ہے

سوئے منزل جانے والوں کیلئے
ہر طرف اک راستا موجود ہے

نجانے کب کہاں کیسے روش اپنی بدلتا ہے
زمانہ جب بھی چلتا ہے تو ٹیڑھی چال چلتا ہے

اُجالوں میں ہمیں ڈھونڈو جو ملنا چاہو تم ہم سے
سنا ہے تم نے کیا شب میں کہیں سورج نکلتا ہے

کبھی میرے ارادوں سے بھی آ کے اسے ہوا ٹکرا
فقط ان بادبانوں پر ہی تیرا زور چلتا ہے

کسے ملتا ہے دوبارہ یہاں موقع سنبھلنے کا
مقدر کا سکندر ہے تُو گرتا ہے، سنبھلتا ہے

لکھا قسمت کا ہم کیسے بدل سکتے ہیں کہ اس پر
نہ تیرا زور چلتا ہے نہ میرا زور چلتا ہے

یہ دل تو اب بھی اچھی صورتوں کا ایسا عاشق ہے
کھلونے دیکھ کر جیسے کوئی بچہ مچلتا ہے

جبین وقت پر لکھا ہوں آیت کی طرح گر میں
تو مجھ کو دیکھ کر ہر شخص کیوں پہلو بدلتا ہے

کوئی مصرع کہیں جو ذہن میں تکمیل پا جائے
اترنے کو سرِ قرطاس پھر اکثر مچلتا ہے

نہ جانے کیسا رشتہ ہے اندھیروں سے ترا ثاقبؔ
ابھرنے لگتی ہیں یادیں تری دن جب بھی ڈھلتا ہے

گلشنِ جاں میں خس و خاشاک سے کیا کیا ہوا
پوچھتے کیوں ہو دلِ صد چاک سے کیا کیا ہوا

کس کو فرصت تھی شبِ فرقت میں پوچھے چاند سے
وقتِ رخصت دیدۂ نمناک سے کیا کیا ہوا

صرف وحشت ہی نہیں تھی موسمِ گل میں مری
تم کیا جانو اس گریباں چاک سے کیا کیا ہوا

دیکھ لو چاروں طرف اور خود سے پوچھو یہ سوال
فہم سے کیا کیا ہوا ادراک سے کیا کیا ہوا

بننا کیا تھا اور کیا مجھ کو بنا ڈالا گیا
وقت کے بے رحم چلتے چاک سے کیا کیا ہوا

یہ فرشتوں کے گماں میں بھی نہ آیا تھا کبھی
کچھ نہ ہونا تھا مگر اس خاک سے کیا کیا ہوا

کچھ بچا ہی کب تھا کوئی سوچتا جو بیٹھ کر
خیمۂ جاں پر شبِ سفاک سے کیا کیا ہوا

قیصر و کسریٰ سے آگے کی بھی کچھ تاریخ پڑھ
تاجداروں کی بچی املاک سے کیا کیا ہوا

اُٹھ کے پہلو سے مرے جاتے ہوئے یہ پوچھنا
شامِ وعدہ اس گریباں چاک سے کیا کیا ہوا

خامشی تجدیدِ الفت میں ہوئی کب کارگر
یہ بتا ثاقب لبِ بیباک سے کیا کیا ہوا

جس شہر میں ایثار و وفا اور ہی کچھ ہے
اُس شہر میں رہنے کا مزہ اور ہی کچھ ہے

خود میں ہیں کبھی گم تو کبھی خود سے مفر ہیں
دیوانوں کے جینے کی ادا اور ہی کچھ ہے

مقبول نہ جو ہو تو سمجھ لو کہ تمہارے
دل میں ہے جدا لب پہ دعا اور ہی کچھ ہے

اب ڈھونڈنا مجھ کو یہاں بے سود ہی ہو گا
ہاں! اب کے مرے گھر کا پتہ اور ہی کچھ ہے

لگتا تو ہے وہ ماہِ لقا آئے گا شاید
اس دل کی میاں اب تو نوا اور ہی کچھ ہے

پھر چاند نے روکا مجھے دریا کے کنارے
دھیرے سے کسی نے یہ کہا اور ہی کچھ ہے

اس ہمسفری کا بھی ذرا پاس تو رکھ لو
موسم جو حسیں ہے تو فضا اور ہی کچھ ہے

وہ ہاتھ کہ جن پر ہے لہو ثبت کسی کا
منصف سے کہو ان کی سزا اور ہی کچھ ہے

عزت کا خیال ان کو نہ ہے پاسِ شرافت
اس دور کے انساں کو روا اور ہی کچھ ہے

ثاقبؔ ہے مجھے علم کہ یہ لوگ ہیں کیسے
انساں نہیں یہ خلق خدا اور ہی کچھ ہے

مرغانِ چمن صحنِ چمن سے نکل گئے
کچھ خواب تھے جو لے کے وطن سے نکل گئے

منصب تھا جن کا عشق وہ سب اہلِ دل یہاں
بکھرے تو اپنی حدِ بدن سے نکل گئے

کچھ لوگ حق کی راہ میں مارے گئے مگر
کچھ لوگ بچ کے دار و رسن سے نکل گئے

لوگوں نے چین سے نہیں جینے دیا کہیں
ہم چلتے ہوئے کوہ و دمن سے نکل گئے

کیا خوف تھا نجانے اندھیروں سے بھی اُنہیں
جگنو بھی رات ہوتے ہی بن سے نکل گئے

اتنی تو سخت جان نہیں تھی یہ زندگی
ثاقبؔ چلے تو اپنی گھٹن سے نکل گئے

جو ہجرت کر گئے اُن کو چمن آواز دیتا ہے
بہت مشکل میں اس پل ہے، وطن آواز دیتا ہے
سنو اس کی صدائے خونچکاں اور پھر بڑھو آگے
یہ لاغر لڑکھڑاتا سا بدن آواز دیتا ہے

لڑکھڑانے لگ گئے جو ایک پیمانے کے بعد
سوچیے وہ کیا کریں گے ہوش میں آنے کے بعد

بعد اس کے تو درِ مقتل مقفل ہو گیا
حوصلہ کس میں تھا جاتا کوئی دیوانے کے بعد

ہجرتوں کا سلسلہ ٹھہرا نہیں تھا عمر بھر
ہم سفر پہ چل دیے تھے تھوڑا استانے کے بعد

ہو گیا الٹا اثر ناصح تری تقریر کا
اور باغی ہو گیا ہوں تیرے سمجھانے کے بعد

ہو گیا ہونا تھا جو اب فکر آگے کی کریں
ہم گلے شکوے نہیں کرتے ہیں لُٹ جانے کے بعد

چاہتا ہے نام ہو جائے ترے جامِ سخن
صفحۂ قرطاس پہ کچھ حرف چھلکانے کے بعد

حد نہیں ہوتی عقیدت کی مگر ایسا بھی کیا
مانگتے ہو جان بھی تم دل کے نذرانے کے بعد

آئے گا جوبن پہ ثاقبؔ یا یونہی رہ جائے گا
رنگِ محفل دیکھنا تم میرے اُٹھ جانے کے بعد

جیسے مرے وجود سے حدت نکال لی
تم نے تو آئینے سے بھی حیرت نکال لی

جب زندگی نے عشق کے معنی سکھا دیے
اس خامۂ وجود سے حسرت نکال لی

تنہائی، جام، یاد، گھٹن اور ایک میں
میں نے بھی خوب جینے کی صورت نکال لی

آنکھوں میں وصل کا فقط اک خواب ثبت تھا
لو آج تم نے وہ بھی عبارت نکال لی

سوچو کہ کیا کرو گے جو منہ زور ہوا نے
آنے کی اس طرف اگر فرصت نکال لی

جس شئے سے عمر بھر مجھے کچھ واسطہ نہ تھا
دیکھا اُسے تو اس کی ضرورت نکال لی

اقبالؔ، میرؔ و غالبؔ و سوؔدا کے ساتھ ہوں
میں نے بھی کس کمال کی نسبت نکال لی

سمندر موج سے عاری، ہوائیں ہو گئیں مسموم
فقط بازارِ میت گرم ہے اور زندگی معدوم
یہ قتل و خوں کے منظر دیکھ کر کہنا ہی پڑتا ہے
کہ اب مقتول و قاتل ہو گئے ہیں لازم و ملزوم

کبھی میں فن کے لیے تو کبھی سخن کے لیے
میں شعر ڈھونڈتا رہتا ہوں اس بدن کے لیے

تمام عمر گنوائی جنہوں نے دھن کے لیے
وہ لوگ آج ترستے ہیں اک کفن کے لیے

یہ دن نکلتا ہے دیدار تیرا کرنے کو
یہ رات جاگتی ہے تیرے بانکپن کے لیے

نظر لگی ہے یہ کس کی سخن کے پروانو!
کٹھن ہے وقت بہت اہلِ انجمن کے لیے

قسم خدا کی بہت خوش نصیب ہیں وہ لوگ
جنہوں نے جان لٹا دی کبھی وطن کے لیے

اندھیرے جب ہوئے دشمن مرے تو پھر میں نے
دریچے وَا کیے رکھے کرن کرن کے لیے

میں اپنے شعر سجاتا ہوں اس طرح ثاقبؔ
سنگھار جیسے ہو لازم کسی دلھن کے لیے

میں اپنی شام کو برباد کر نہیں سکتا
برا نہ مان تجھے یاد کر نہیں سکتا

کوئی محفل نہیں پر میرِ محفل ہو کے بیٹھے ہیں
اندھیری رات میں ہم ماہِ کامل ہو کے بیٹھے ہیں

سنو اک بار تم بھی سوختہ حالوں میں آ بیٹھو
تمہارے راستے میں ہم بھی حائل ہو کے بیٹھے ہیں

نہیں روحانیت سے دور کا بھی واسطہ اپنا
مریدوں میں مگر ہم پیرِ کامل ہو کے بیٹھے ہیں

سزا کیسی جزا کیسی کہاں کا عدل اور فتویٰ
یہاں مجرم تھے جتنے لوگ، عادل ہو کے بیٹھے ہیں

عجب سا آئینہ ہے زندگی کا سامنے اپنے
ہم اپنے روبرو، اپنے مقابل ہو کے بیٹھے ہیں

یہاں ہے کون کتنے پانی میں معلوم ہے ہم کو
بہت کچھ جانتے ہیں پھر بھی جاہل ہو کے بیٹھے ہیں

عجب نیرنگیِ دنیا کا عالم دیکھ لو تم بھی
جو دینے والے تھے کل تک وہ سائل ہو کے بیٹھے ہیں

انہیں کل پھر نئی پرواز کا ہے سامنا ثاقبؔ
ہوائے شہر سے جو آج گھائل ہو کے بیٹھے ہیں

بھٹکتا رہتا ہے تو بھی کہاں کہاں سورج
خدا کرے ملے تجھ کو کہیں اماں سورج

تمام روز میرے ساتھ ساتھ چلتا ہے
کہ جیسے میرا اکیلا ہے نگہباں سورج

اگر ہوں موم پگھل جاؤں گا گھڑی بھر میں
میں سامنے ہوں مرا لے لے امتحاں سورج

کسی کے اشک ترے سامنے گرے ہوں گے
جو تو بھی ہونے لگا ہے دھواں دھواں سورج

تُو دیکھ لے جو ہمارے سوا نظر آئے
تجھے کہیں بھی ملے گی نہیں اماں سورج

اے چاند! کیسے تجھے دن میں دیکھ سکتا ہوں
کہ آ رہا ہے ترے میرے درمیاں سورج

بہت عزیز ہے اے چاند تُو مگر ڈر ہے
کہ ہو نہ جائے کہیں مجھ سے بدگماں سورج

وہ چاہے ہو پسِ دیوار یا سرِ دیوار
ہر ایک سائے کا لیتا ہے امتحاں سورج

یہ دریا جب کبھی بپھرے سمندر سے الجھتا ہے
میں ہنستا ہوں کہ یہ اپنے مقدر سے الجھتا ہے

ہر اک کے بس میں کب ہوتا ہے ٹکرانا زمانے سے
وہی دیوانہ ہوتا ہے جو پتھر سے الجھتا ہے

پہنچتی کیوں نہیں تجھ تک دعائے وصل بھی میری
مرا ہر سجدۂ الفت ترے در سے الجھتا ہے

نجانے کب مری دیوانگی کو ہوش آئے گا
خمارِ آگہی ہر لمحے ساغر سے الجھتا ہے

میں صدقے جاؤں، اُس ہستی کے قدموں میں بکھر جاؤں
بچانے اپنی اُمت کو جو محشر سے الجھتا ہے

کہاں نام ونشاں رہتا ہے پھر ثاقبؔ کہیں اس کا
کوئی سیارہ جب بھی اپنے محور سے الجھتا ہے

کیا ہو گیا فرات ترے انتشار کو
نیزہ بنا دیا گیا پانی کی دھار کو

جب سے نظر میں ہم نے رکھا روزگار کو
بالائے طاق رکھنا پڑا تیرے پیار کو

آجائیں تو قفس میں ذرا طائرانِ شوق
پہچان جائیں گے یہ رموزِ حصار کو

درپیش اب ہے کتنا سفر کچھ خبر نہیں
جھاڑا نہیں ہے ہم نے ابھی تک غبار کو

جھپکی نظر تو رنگِ فسانہ بدل گیا
جلدی بہت تھی جانے کی ایسی بہار کو

آتا رہا ہمیشہ ہی آندھی کی زد پہ میں
کیا ہو گیا تھا جانے مرے اختیار کو

خود کر لیا ہے ہم نے گریباں کو تار تار
اور دوش دے رہے ہیں تیرے انتظار کو

ثاقبؔ خمارِ عشق ہے سر پر چڑھا ہوا
آساں نہیں اُتارنا ایسے بخار کو

سچ بولنے کے جرم کا حقدار میں بھی تھا
اک آپ ہی نہیں تھے سرِ دار میں بھی تھا

بس اک خطا ہی باعثِ تفریق ہو گئی
ورنہ اس آسمان کا شہکار میں بھی تھا

اُکتا گئے تھے مجھ سے اگر گھر کے بام و در
تو کیا ہوا کہ عُمر سے بیزار میں بھی تھا

اک تو ہی جاگتا نہ تھا فرقت کی رات میں
یہ چاند ہے گواہ کہ بیدار میں بھی تھا

یہ بات تھی الگ کہ تہی دست میں رہا
ورنہ تو ہر خوشی کا خریدار میں بھی تھا

ثاقبؔ وہ جس کو وصل کی شب کہتے ہیں یہاں
لب بستہ زندگی میں طلبگار میں بھی تھا

باتیں ہیں سب نصیب کی کیا عشق کیا جمال
تیرا کوئی کمال نہ میرا کمال

دامن چھڑا کے ہنس کے جدا خود کو مجھ سے کر
کس نے کہا ہے تجھ کو کہ مشکل میں خود کو ڈال

ہر راہ میں تو میرے انا کا حصار ہے
رستہ مفاہمت کا کوئی ہے تو پھر نکال

کیا تم کو یاد ہے کہ جدا جب ہوئے تھے ہم
آنکھوں میں بس گیا تھا فقط ایک ہی سوال

بکنا ہی تھا انہیں یہ مشیت خدا کی تھی
یوسف خرید لیتی زلیخا کی کیا مجال

کم ظرف بھی ملیں گے یہاں پر میاں بہت
ثاقبؔ یہ میکدہ ہے ذرا خود کو تُو سنبھال

حسین موسمِ دیدار لے کے آئے ہیں
ہمارے واسطے وہ پیار لے کے آئے ہیں

خوشا کہ بزم میں اک جشن کا سماں اب ہے
خوشا ادب کا وہ معیار لے کے آئے ہیں

یہی ہیں صبحِ بنارس یہی ہیں شامِ اودھ
محبتوں کا وہ انبار لے کے آئے ہیں

غزل سجانی ہے اس شام سو مرے مہماں
دلھن کے واسطے سنگھار لے کے آئے ہیں

ہے ناز سب کو یہاں ان کی اس زیارت پر
کہ شاعری کا وہ معیار لے کے آئے ہیں

سخن قبول ہو ان کا کہ آپ ہی کے لیے
نجومِ شرق بہت پیار لے کے آئے ہیں

لیاقت علی عاسم اور سعید آغا کی دمام آمد پر ا پریل ۵، ۲۰۱۲

مستی میں لہراتا ہوں خوش رہتا ہوں
پاگل ہوں نا گاتا ہوں خوش رہتا ہوں

ہر شب جھیل کنارے جا کر چپکے سے
چاند کو میں چھو آتا ہوں خوش رہتا ہوں

پہلے اس کی آنکھیں دھیان میں آتی ہیں
پھر ساغر چھلکاتا ہوں خوش رہتا ہوں

میں اب اکثر اپنی تنہا راتوں کو
یادوں سے مہکاتا ہوں خوش رہتا ہوں

ترکِ عشق تو دونوں کی مجبوری تھی
دل کو پھر سمجھاتا ہوں خوش رہتا ہوں

ممکن ناممکن کی باتوں میں اکثر
جب خود کو الجھاتا ہوں خوش رہتا ہوں

اس کے خوابوں کے پہلو میں آ کر میں
چپکے سے سو جاتا ہوں خوش رہتا ہوں

مجھ کو تنہا رستے راس نہیں آتے
بھیڑ میں دھکے کھاتا ہوں خوش رہتا ہوں

سگرٹ ہو کہ دل ہو اپنا میں ثاقبؔ
ان کو جب سلگاتا ہوں خوش رہتا ہوں

چلی مغرب سے جو بادِ صبا کچھ اور کہتی ہے
سنبھل جاؤ چمن والو گھٹا کچھ اور کہتی ہے

یقیں کیسے کروں اے باغباں محفوظ ہے گلشن
گلوں کو چھیڑتی بادِ صبا کچھ اور کہتی ہے

عجب مشکل میں ہوں سجدہ اسے کرنا اگر چاہوں
عقیدت اور کہتی ہے انا کچھ اور کہتی ہے

بچالے گر بچا سکتا ہے تُو اپنے نشیمن کو
تڑپتی برق اور بہکی ہوا کچھ اور کہتی ہے

میں کیسے تیرا کہنا مان لوں تو خود سمجھ زاہد
جو میخانے پہ چھائی ہے گھٹا کچھ اور کہتی ہے

جو سوچوں تو مجھے چلنا ہے سیدھی راہ پر ثاقبؔ
جو دیکھوں تو زمانے کی ہوا کچھ اور کہتی ہے

اب ایسا بھی مرے یارو گیا گزرا نہیں ہوں میں
رکابِ زر میں سکے کی طرح رکھا نہیں ہوں میں

مسلسل اک نئی منزل میری نظروں میں رہتی ہے
جو رک جاؤں کسی منزل پہ وہ رستہ نہیں ہوں میں

پلٹ سکتا ہوں میں بازی کسی بھی وقت جب چاہوں
رمی کے کھیل میں پھینکا ہوا پتا نہیں ہوں میں

خموشی سے ہر اک دکھ کو چھپا لیتا ہوں میں دل میں
بس اتنی بات ہے مشکل میں بھی روتا نہیں ہوں میں

نہ جانے جھانکتا ہے کون میری پشت سے ثاقبؔ
نظر آتا ہے جو شیشے میں وہ چہرہ نہیں ہوں میں

کہاں لے آئے تم ہمت کا قصہ
ابھی باقی ہے اک وحشت کا قصہ

وہاں گم گشتہ صدیاں ڈھونڈنی تھیں
جہاں چھیڑا گیا ساعت کا قصہ

ابھی پچھلا سفر باقی ہے میرا
تو کیوں پھر سے نئی ہجرت کا قصہ

ہمارے اور تمہارے وصل میں اب
لو در آیا ہے کیوں عجلت کا قصہ

جنہوں نے ہجر ہی کاٹا ہو صاحب
سنانا کیا انھیں فرقت کا قصہ

وہی تھی کج ادائی آئینے کی
وہی درپیش تھا حیرت کا قصہ

دکھاؤں گا ترا چہرا مری عادت پرانی ہے
تجھے بھی اب نہ روکوں گا مری عادت پرانی ہے

میں اس امید پر رہتا ہوں کوئی تھام ہی لے گا
سنبھل کر لڑکھڑا جانا میری عادت پرانی ہے

بلا کا ظرف رکھتا ہوں میں آنسو ضبط کرتا ہوں
سمیٹے رکھتا ہوں دریا، مری عادت پرانی ہے

کوئی کتنا بھی سمجھائے خطاؤں پر مجھے لیکن
نہیں ہوتا ہے پچھتاوا مری عادت پرانی ہے

مری گھٹی میں شامل ہے بدلنا راستے اپنے
کہیں پر میں نہیں ٹکتا میری عادت پرانی ہے

مصائب چاہے جتنے ہوں سدا بے باک رہتا ہوں
نہیں رکھتا کوئی خدشہ مری عادت پرانی ہے

بدلتے موسموں سے اب تلک میں نے یہ سیکھا ہے
بدل لیتا ہوں میں چہرا، مری عادت پرانی ہے

میں دہرا روپ بھی رکھتا ہوں اپنی ذات میں ثاقبؔ
دیا کرتا ہوں میں دھوکا مری عادت پرانی ہے

اس لیے خود کو بھی رکھا ہے اکیلا اب تک
میرا ہونا کہ نہ ہونا ہے معمہ اب تک

میں اتر جاتا سمندر میں کبھی کا لیکن
پاؤں پکڑے ہوئے بیٹھا رہا دریا اب تک

بس یہی سوچ کے شب گھر کو پلٹ آتا ہوں
جاگتا ہوگا کوئی ایک دریچہ اب تک

تو جو گن گاتا ہے دنیا کے تجھے کیا معلوم
تو نے کھایا ہی نہیں ہے کوئی دھوکا اب تک

تیری تصویر ترے خواب ترا لمس بدن
گوشۂ دل میں مرے ہے یہ اثاثہ اب تک

ہم تو درویش صفت لوگ ہیں چپ رہتے ہیں
کیوں سمجھ پائی نہیں ہے ہمیں دنیا اب تک

اب تو تعبیر بھی اکتا سی گئی ہے مجھ سے
خواب جو دیکھا تھا میں نے ہے ادھورا اب تک

ایک ہلکی سی نگاہوں میں رمق ہے اُس کی
وقت نے اپنا دکھایا نہیں چہرا اَب تک

مفلسی نے مرے بچے کو رکھا خوفزدہ
اُس نے کاندھے سے اتارا نہیں بستہ اب تک

بند ہو جائے نہ اُمید کا یہ بھی رستا
خوش نصیبی ہے کھلا ہے درِ توبہ اب تک

ہو گیا ہو کہیں سورج نہ مقید ثاقبؔ
شہرِ دل میں جو نہ آیا ہے اُجالا اب تک

شجر، کانٹے، کلی، گل، سب چمن میں
ہر اک یکتا ملا ہے اپنے فن میں

ابھی احساس ہے زندہ ہمارا
ابھی تو جاگتا ہے دل بدن میں

ہر اک حیرت سے مجھ کو تک رہا ہے
ہوں جیسے اجنبی اپنے وطن میں

ضرورت اُن کو لے کے اُڑ گئی ہے
پرندے اب نہیں رہتے چمن میں

بنامِ گل، قمر، سورج، ستارہ
تُو شامل تو رہا میرے سخن میں

سڑک پر ہاتھ پھیلائے کھڑا ہے
نیا جوبن پرانے پیرہن میں

ہواؤ! امتحاں لے لو ہمارا
کہ جینا آگیا ہم کو گھٹن میں

وہی لُوٹے بھی جو رستہ دکھائے
کہاں ہے فرق رہبر راہزن میں

وہی ہیں لیلیٰ و مجنوں کے قصے
نیا کچھ بھی نہیں بزمِ سخن میں

خرد مندوں کا کہنا ہے کہ نادانی کا سودا ہے
کسی کا دکھ بٹانا کیا پریشانی کا سودا ہے؟

ہر اک پل کا تغیر بس یہی سمجھا گیا ہم کو
کہ عکس و آئینے میں صرف حیرانی کا سودا ہے

خزانے رحمتوں کے کیا سمٹ پائیں گے دامن میں
درِ رحمت سے اپنا تنگ دامانی کا سودا ہے

کسی بھی دکھ کو اپنے قیمتی ہونے نہیں دیتا
کہ عمرِ مختصر میں یہ جہاں بانی کا سودا ہے

برا نہ مان اے واعظ! میں دل کی بات کہتا ہوں
تری صحبت میں رہنا بھی تو نادانی کا سودا ہے

کوئی بھی عہد کرنا ہو تو اتنا دھیان میں رکھنا
کہ وعدہ توڑ دینا تو پشیمانی کا سودا ہے

حقیقت میں تو ثاقبؔ کچھ نہیں بس جان لو اتنا
کہ ایفائے وفا تو اک نگہبانی کا سودا ہے

زندگی کی تلاش میں ثاقب
زندگی تھی گذر گئی اپنی

بس اتنا حلقۂ یاراں سے واسطہ رکھا
کہ جتنا حالِ پریشاں سے واسطہ رکھا

تمام عمر سرابوں سے دوستی رکھی
تمام عمر ہی امکاں سے واسطہ رکھا

فقیر بیٹھا رہا حجرۂ قناعت میں
فقیہِ شہر نے ایواں سے واسطہ رکھا

کہا یہ کس نے ہمیں وصل کی طلب تھی کوئی
تمام شب غمِ ہجراں سے واسطہ رکھا

ہر ایک دشمنِ جاں ہو گیا محبت میں
جو ہم نے بزمِ نگاراں سے واسطہ رکھا

ہمیں بہار نے کیا کیا لبھایا تھا ثاقبؔ
سو ہم نے اپنے گریباں سے واسطہ رکھا

کیوں ہر اک شخص کی آنکھوں میں نمی ہے اب کے
پھر کہیں گریے سے دیوار گری ہے اب کے

مرحلہ ہونے نہ ہونے کا عجب آیا ہے
مرگ و ہستی میں عجب جنگ چھڑی ہے اب کے

میں نے آنکھوں ہی سے آنکھوں کی سنی ہیں باتیں
دل لگی اب کے نہیں، دل کی لگی ہے اب کے

کیا اذیت ہے محبت کو مہیا رہنا
ہر گھڑی ہجر کا لگتا ہے صدی ہے اب کے

دیدِ خوباں بھی نہیں چشمکِ جاناں بھی نہیں
جانے اطراف میں کس شئے کی کمی ہے اب کے

اپنے آپے میں نہیں ہوش ٹھکانے بھی نہیں
کس کی خوشبوئے بدن مجھ میں رچی ہے اب کے

لگ رہا ہے کسی طوفان کا اندیشہ ہے
ہر گلی شہر کی سنسان پڑی ہے اب کے

جس میں اک میرے سوا کوئی نہیں ہے ثاقبؔ
دل کے آنگن میں عجب شام سجی ہے اب کے

کس لیے کس کی طرف کون گیا دیکھتے ہیں
ہم ہوا دیکھتے ہیں سمتِ ہوا دیکھتے ہیں

دوریاں سنتے ہیں کہ پیار بڑھا دیتی ہیں
آؤ کچھ دن کے لیے رہ کے جدا دیکھتے ہیں

روزِ محشر سے مری جان ڈراتے ہو عبث
حشر ہم روز ہی سینے میں بپا دیکھتے ہیں

آؤ بازارِ سخن میں ذرا چل کے دیکھیں
کون کھوٹا ہے یہاں کون کھرا ، دیکھتے ہیں

شاید ہم پر بھی کرم ہو کسی لمحے اُن کا
ہم بھکاری ہیں سدا اُن کی عطا دیکھتے ہیں

یہ بھی معراجِ عقیدت ہے کہ جس میں ثاقبؔ
اپنے ہر کام میں ہم اس کی رضا دیکھتے ہیں

عجب تھا یاس کا منظر جو تم نہیں آئے
نظر میں آئے سمندر جو تم نہیں آئے

تو پھر یہ وصل کہاں ہجر ہی رہا ہوگا
ہمارے پاس بھی آ کر جو تم نہیں آئے

اٹھا لیا درِ امکاں سے صبح ہوتے ہی
خیال و خواب کا بستر جو تم نہیں آئے

پرندے ہجر زدہ تھے اڑان کیا بھرتے
سمیٹے بیٹھے رہے پر جو تم نہیں آئے

شکستہ خواب یہ بکھرے ہوئے حروفِ سخن
لو اِن پہ رکھ دیا ساغر جو تم نہیں آئے

دیے بجھائے تھے گھر کے یہ سوچ کر میں نے
یہی تھا میرا مقدر جو تم نہیں آئے

مذاق اڑاتی رہی بزمِ کہکشاں میرا
جھکائے بیٹھا رہا سر جو تم نہیں آئے

سو بند رہنا تھا تم کو سمٹ ہی جانا تھا
اَنا کے خول سے باہر جو تم نہیں آئے

علامتیں سبھی میرے خلاف تھیں ثاقبؔ
دھواں دھواں رہے منظر جو تم نہیں آئے

کیمیا گر! کہیں تکمیل میں حد بندی تھی
آب اور تیل کی تحلیل میں حد بندی تھی

فاصلہ جس کا نگاہوں میں بھی طے ہو جاتا
ایسے پیغام کی ترسیل میں حد بندی تھی

عمرو عیار! مرا دل نہیں دیکھا تُو نے
ورنہ کہتا تری زنبیل میں حد بندی تھی

میں تو آزاد فضاؤں میں رہا کرتا تھا
زندگی تیری تو تحویل میں حد بندی تھی

ایک دیوانہ زمانے سے کہاں تک لڑتا
جادہ ءِ حسن کی تمثیل میں حد بندی تھی

دیکھ کر بھی نہیں دیکھے کوئی شہزادی کو
حاکمِ وقت کی تعمیل میں حد بندی تھی

عقلِ کل کی بھی عطا ساتھ میں اک دل بھی دیا
یعنی انسان کی تشکیل میں حد بندی تھی

پھر بھی دیوانے کو زنجیر نہ کر پایا کوئی
عشق میں یوں تو ہر اک میل میں حد بندی تھی

اس کی آنکھوں کو میں پڑھ سکتا تھا لیکن ثاقبؔ
اس کی آنکھوں کی تو تفصیل میں حد بندی تھی

کہاں کی کیسی محبت شراب لے آؤ
مجھے ہے شام سے وحشت شراب لے آؤ

یہ مرنے ورنے کی باتیں تمہیں مبارک ہوں
مجھے ہے جینے کی عادت شرب لے آؤ

یقین میری گواہی پہ بھی کبھی کر لو
لو دیکھ لو مری حالت شراب لے آؤ

میں زندگی کو سمجھنے میں ہوں بہت مصروف
تمہیں اگر ملے فرصت شراب لے آؤ

ذرا سا صبر کہ یہ رات ڈھلنے والی ہے
بیاں کروں گا صداقت شراب لے آؤ

تکلفات میں کیوں پڑ گئے ہو تم رندو!
اٹھاؤ خوانِ ضیافت شراب لے آؤ

بہت دنوں سے طبیعت اداس رہتی ہے
نہ وصل ہے نہ ہی فرقت شراب لے آؤ

وہ آ رہا ہے مری سمت خیر ہو یارو
دو آتشہ ہو قیامت شراب لے آؤ

کمال کرنا جو ٹھہرا کمال کر دوں گا
کرو بس اتنی عنایت شراب لے آؤ

وہ آنکھوں آنکھوں میں پیغام دے گئی ہے مجھے
اُسے ہے مجھ سے محبت شراب لے آؤ

یہ سچ نہیں ہے مگر پھر بھی سب سے کہتا ہوں
مجھے ابھی تو ہے فرصت شراب لے آؤ

جو ان ہاتھوں میں دنیا کو سونپ کر ثاقبؔ
لو میں چلا درِ غفلت شراب لے اؤ

ہر اک لمحے تری ضد جانے کی اچھی نہیں لگتی
کلائی پر تری مجھ کو گھڑی اچھی نہیں لگتی

ہمارے درمیاں کوئی تجھے اچھا نہیں لگتا
مجھے بھی درمیاں یہ روشنی اچھی نہیں لگتی

اگرچہ وقت نے دھندلا دیا اس کو مگر اب بھی
تری تصویر بٹوے میں چھپی اچھی نہیں لگتی

ترے کہنے پہ اک شب رک گیا پر یاد رکھ اتنا
مسافر کو کسی کی خوشدلی اچھی نہیں لگتی

کبھی نظریں اٹھا لینا کبھی نظریں جھکا لینا
غریبوں کو تری جادوگری اچھی نہیں لگتی

کسی کی زلف ہو، موسم ہو ، جگنو ہو کہ دریا ہو
سکوتِ شب میں ان کی برہمی اچھی نہیں لگتی

ترا کہنا بجا ہے اے امیرِ شہر یہ مانا
سیاست ہے یہ اس میں دوستی اچھی نہیں لگتی

قریبِ آبِ رواں اس لیے نہیں جاتا
وہ مجھ کو قطرے سے کمتر دکھائی دیتا ہے
وہ جھیل ہو یا سمندر مجھے سدا اس میں
لبِ فرات کا منظر دکھائی دیتا ہے

غم تھا کسے جو عشق کے رستے عجیب تھے
ہم پہ بھی بارشوں کے کرشمے عجیب تھے

آنکھوں میں رتجگے تھے کہ سپنے عجیب تھے
اس شخص کو تو چاہنے والے عجیب تھے

بادل بھی خود کو کھول رہا تھا ورق ورق
اترے جو آنکھ پر وہ صحیفے عجیب تھے

اب تو وضاحتوں نے مراسم بدل دیے
وہ دن بھی کیا تھے جب یہی رشتے عجیب تھے

شہ زور تھے شکست نہیں مانتے تھے وہ
دل کی بساط پر مرے مہرے عجیب تھے

پاگل سمجھ رہے تھے ہمیں لوگ بزم میں
ہم تھے عجیب، اپنے فسانے عجیب تھے

اس بار گھر سے لے کے دعا وہ چلے گئے
مارا انہیں کسی کو لٹیرے عجیب تھے

ہم کو بھی روشنی سے شکایت کہاں ہوئی
اچھا ہوا کہ اپنے ہی سائے عجیب تھے

نہ دشمنی ہے کسی سے نہ دوستانہ ہے
تو کیوں سبھی کا رویہ منافقانہ ہے

رکا رہا ہوں سرِ بامِ زندگی برسوں
وفا کی راہ کا بس اتنا شاخسانہ ہے

عمل نہ کرنا کبھی مشورے پہ تم میرے
یہ مشورہ تو مرے دوست مخلصانہ ہے

ذرا سنبھل کے مری جان فیصلہ کرنا
مزاج اپنے قبیلے کا جارحانہ ہے

میں لے کے جا تو رہا ہوں تجھے اے چشمِ غزل
سراپا اس کا بھی کچھ زیادہ شاعرانہ ہے

خدایا خیر ہو کس سمت سے چلی ہے ہوا
مزاجِ حلقۂ یاراں بھی عاجزانہ ہے

گریز کیسے بھلا آئینوں سے وہ کرتا
کہ اس کا آج بھی انداز خسروانہ ہے

رکے تو فاصلہ بڑھ جائے گا بہت ثاقبؔ
ہر اک زمانہ میاں اک نیا زمانہ ہے

لفظ مبہم ہی سہی پیار سے کہہ آتا ہوں
دل کی باتیں در و دیوار سے کہہ آتا ہوں

عشق میں جانتا ہوں راز ضروری ہے، مگر
کیا کروں پھر بھی میں دو چار سے کہہ آتا ہوں

سچ کہوں کیسے کہ ہمت ہی نہیں ہوتی ہے
اچھے ہو جاؤ گے بیمار سے کہہ آتا ہوں

دشتِ وحشت کو پلٹتا ہوں چمن سے جب بھی
شاد و آباد رہو، خار سے کہہ آتا ہوں

جان پہچان کے اب لوگ کہاں ملتے ہیں
میں سلامت ہوں یہ اغیار سے کہہ آتا ہوں

گھر اپنے میں درد کے چہرے لے آتا ہوں
شب ہوتے ہی چاند ستارے لے آتا ہوں

ساحل پر تنہا میں آتا ہوں لیکن
ساتھ میں اپنے تیرے جلوے لے آتا ہوں

جس منڈی میں چاند ستارے بکتے ہوں
اُس منڈی میں اپنے سپنے لے آتا ہوں

جب بھی سورج ڈھلنے لگتا ہے پیارے
آنکھوں میں کچھ رنگ سنہرے لے آتا ہوں

اُڑ جاتے ہیں صحنِ چمن سے جو ثاقبؔ
گھر اپنے وہ سارے پتے لے آتا ہوں

خود بھی عجیب اس کا اثر بھی عجیب ہے
یہ چودھویں کی رات کا ڈر بھی عجیب ہے

وہ بھی عجیب دل ہے کہ جس میں نہ ہو خلش
سودا نہیں ہو جس میں وہ سر بھی عجیب ہے

اس معرکے میں جیت بھی ہے صورتِ شکست
کشتی سے لڑ رہا ہے بھنور بھی عجیب ہے

محبس ہے وہ کہ جس سے ہوا کا گزر نہیں
جس میں نہیں ہے پیار، وہ گھر بھی عجیب ہے

ناقدریِ زمانہ کی سہتا ہے دھوپ بھی
پھل اپنے بانٹتا ہے شجر بھی عجیب ہے

چلنا کسی کے ساتھ ٹھہرنا کسی کے پاس
ثاقبؔ محبتوں کا سفر بھی عجیب ہے

تجھے جہاں کی مروت نے مار رکھا ہے
مجھے تو تیری محبت نے مار رکھا ہے

کوئی ترستا ہے اک پل کے وصل کو تیرے
کسی کو لطفِ سخاوت نے مار رکھا ہے

چلو بساتے ہیں دنیا نئی کہیں جا کر
یہاں تو اہلِ رقابت نے مار رکھا ہے

ہر ایک پل کا تغیر ہر ایک پل کا حساب
اس آئینے کو رعایت نے مار رکھا ہے

شجر کئی ہیں ابھی میرا راستہ روکے
ہواؤں کو اسی حیرت نے مار رکھا ہے

گزارنا تجھے مشکل نہ تھا شبِ ہجراں
ہمیں ہماری شرافت نے مار رکھا ہے

ہر ایک صبح مسافت نئی بلائے ہمیں
یہ روز روز کی ہجرت نے مار رکھا ہے

جیوں تو کیسے جیوں ہجر میں ترے ثاقبؔ
مجھے تو صبر کی وحشت نے مار رکھا ہے

سبھی چاکِ گریباں آ گئے کیا
سفیرانِ گلستاں آ گئے کیا

کوئی مانوس سی خوشبو ہے گھر میں
مرے گھر میں وہ مہماں آ گئے کیا

سکوتِ مرگ طاری ہر طرف ہے
سبھی شہرِ خموشاں آ گئے کیا

سرِ دارِ محبت جا رہے ہیں
کہ ہم بھی زیرِ امکاں آ گئے کیا

دھنک کے رنگ پھر چمکے بہت ہیں
اجالوں میں شبستاں آگئے کیا

صفِ ماتم بچھا لیں گے عزیزو
بتاؤ سوگواراں آ گئے کیا

بہت زوروں سے دل دھڑکا ہے اپنا
جو تھے ہم سے گریزاں آگئے کیا

لہو رسنے لگا شعروں سے ثاقبؔ
غزل میں بچھڑے یاراں آگئے کیا

منا ؤ جشن ، کرو سب دھمال ، رقص کرو
سوادِ ہجر میں رقصِ وصال، رقص کرو

نکل سکو گے کبھی خواہشوں کے جنگل سے
کرو نہ خود سے ابھی تم سوال ، رقص کرو

یہ دورِ عہدِ سلاسل ہو غم نہیں ہے مگر
جگہ جگہ پہ بچھے ہوں گے جال،رقص کرو

گزرتے کیوں ہو دبے پاؤں دشتِ امکاں سے
یقین تم کرو اپنا بحال ، رقص کرو

حسین رات حسیں لوگ اور حسیں ساتھی
اسی کو کہتے ہیں کارِ محال ، رقص کرو

سوال یہ ہے کہ تعبیرِ خواب کیا ہو گی
یہ پوچھنے کی ہے کس میں مجال ،رقص کرو

ابھی ترنگ میں آئی ہیں محفلِ رنداں
ابھی سے کیسے جواب و سوال ، رقص کرو

نہ جانے کب سے مجھے آ کر وہ چھو گیا ثاقبؔ
کہ اُٹھ رہا ہے رگوں میں اُبال، رقص کرو

مری وفا پہ بلا کا یقین رکھتے ہو
تم اپنے پیروں تلے کیوں زمین رکھتے ہو

کہیں میں یاد تو آنے نہیں لگا تم کو
تم اپنی آنکھوں پہ کیوں آستین رکھتے ہو

وہ عشق جس کو کہا عشقِ رائیگاں سب نے
کمال ہے کہ اسی کو قرین رکھتے ہو

منا ہی لیتے ہو روٹھے ہوؤں کو اک پل میں
دماغ تم بھی غضب کا ذہین رکھتے ہو

یہ میرا حسنِ نظر ہے کہ آئینے کا کمال
تم اپنے آپ کو کتنا حسین رکھتے ہو

تعلقات زمانے سے تم بھی تو ثاقبؔ
ہے دکھ اسی کا بڑے بدترین رکھتے ہو

ہاتھ اٹھائے ہیں تو پھر لب پہ دعا ہے یعنی
معترف ہو ہی گیا دل کہ خدا ہے یعنی

جھلملاتا ہے دیا حبس کے بھی عالم میں
غم نہیں پھر مرے کمرے میں ہوا ہے یعنی

قتل کا پھر مرے فرمان ہوا ہے جاری
بابِ مقتل مری خاطر ہی کھلا ہے یعنی

کچھ نئے نجم مجھے آج نظر آئے ہیں
میرے سر پر یہ نئی شب کی قبا ہے یعنی

وہ کوئی گل ہی سہی سنگ سہی، خشت سہی
کچھ نہ کچھ آ کے مرے دل پہ لگا ہے یعنی

میری آنکھوں سے نکل کے بھلا جاتے کیوں ہو
اک نیا شہر کہیں اور بسا ہے یعنی

پھر نکالی گئی اک لاش کسی کسی کی
نہر میں پھر کہیں اک ٹوٹا گھڑا ہے یعنی

جو بھی مانگا وہ ملا دستِ طلب کو ثاقبؔ
میری جھولی میں کوئی دستِ عطا ہے یعنی

ایک ہی دید میں بے کل سے مجھے کر دیتا ہے
وہ حسیں شخص مکمل سے مجھے کر دیتا ہے

مجھ میں پھر دیر تلک اس کی مہک رہتی ہے
مجھ کو چھوتا ہے تو صندل سے مجھے کر دیتا ہے

اس کی تعریف میں بس اتنا ہی لکھ سکتا ہوں
وہ سراپا ہے کہ پاگل سے مجھے کر دیتا ہے

میری وحشت میری دیوانگی کا حل ہی نہیں
میں تو صحرا ہوں وہ جنگل سے مجھے کر دیتا ہے

خواب میں آتا ہے جب بھی تو وہ ثاقبؔ مجھ پر
یوں برستا ہے کہ جل تھل سے مجھے کر دیتا ہے

جب ہوا جینا سزا تو خود پہ ہم ہنسنے لگے
ہو گئی جب انتہا تو خود پہ ہم ہنسنے لگے

سب پرانے زخم تو قصہ پرانا ہو گئے
دکھ نیا جب بھی ملا تو خود پہ ہم ہنسنے لگے

ربط اک ٹوٹا تو سازِ دل نے چپ ہی سادھ لی
اک تعلق جب بنا تو خود پہ ہم ہنسنے لگے

عمر کی ساری ریاضت رتجگوں کو سونپ کر
شعر جب کوئی لکھا تو خود پہ ہم ہنسنے لگے

اشک آنکھوں کے مکیں تھے جب تلک تو غم نہ تھا
جب ہوئے بے آسرا تو خود پہ ہم ہنسنے لگے

ہم تو اپنی ذات میں خود اک شبستاں تھے مگر
دل کبھی بجھنے لگا تو خود پہ ہم ہنسنے لگے

ہمسفر لگتا تھا میری راہ سے واقف بھی تھے
خوف جب کچھ کچھ بڑھا تو خود پہ ہم ہنسنے لگے

ہم تو خاموشی سے دکھ سہتے تھے لیکن اس کے ساتھ
ایک دن ایسا ہوا تو خود پہ ہم ہنسنے لگے

بات ہی ایسی تھی اس کی ڈائری میں ایک دن
پایا اک صفحہ مڑا تو خود پہ ہم ہنسنے لگے

آئینہ خانے میں اپنے لب پہ پہرے تھے بہت
وا ہوا حیرت کدہ تو خود پہ ہم ہنسنے لگے

کوئی تو کام کرنے دے مری جاں
مجھے آرام کرنے دے مری جاں

وہ چاہے عشق ہو یا شاعری ہو
کہیں تو نام کرنے دے مری جاں

خوشی پہ کیا، مجھے اب تو دکھوں پر
صدائے عام کرنے دے مری جاں

تھکاوٹ ہے مسافت کی، گھڑی بھر
کہیں بسرام کرنے دے مری جاں

کبھی میں خود کو بھی کچھ جان پاؤں
اکیلے شام کرنے دے مری جاں

میں خود کو آئینہ کرنے چلا ہوں
مجھے یہ کام کرنے دے مری جاں

کسی سے والہانہ ہو گئی ہے
محبت دلبرانہ ہو گئی ہے

فقط مَیں ہی نہیں آمد پہ تیری
یہ شب بھی عاشقانہ ہو گئی ہے

اُسے دل ، درد مجھ کو دے دیا ہے
سو قسمت منصفانہ ہو گئی ہے

پڑھا ہے میرؔ کا دیوان جب سے
طبیعت شاعرانہ ہو گئی ہے

سنو! ملنا نہیں اب تم کسی سے
یہ دنیا حاسدانہ ہو گئی ہے

بہت خوش ہوں کہ میری واقفیت
کسی سے غائبانہ ہو گئی ہے

کہانی بن چکی میری محبت
تو کیا وہ بھی فسانہ ہو گئی ہے

قصیدے کیا پڑھے غالبؔ کے ثاقبؔ
طبیعت خسروانہ ہو گئی ہے

شب کو بجلی تلاش کرتا ہوں
دن کو پانی تلاش کرتا ہوں
جگمگاتا تھا جو دلھن کی طرح
وہ کراچی تلاش کرتا ہوں

اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے حیرانی کو
میں چلا آیا ہوں گھر لے کے پریشانی کو

کیوں مرے ساتھ پلٹ آتی ہے میرے گھر میں
میں تو بازار میں رکھ آتا ہوں ویرانی کو

کیسے ادراک کی منزل پہ اسے لے جاتے
ہم نے خود سے بھی چھپایا ہے بیابانی کو

میں نے بھی کوئی کرشمے نہیں دیکھے اب تک
شوق سے کیجیے حیراں میری حیرانی کو

اپنے سجدے میں وہاں سے بھلا کیسے لاتا
چھوڑ آیا تھا وہیں اپنی میں پیشانی کو

دشت آباد ہوئے جاتے ہیں ہر روز مگر
کیوں نظر لگتی نہیں ہے مری ویرانی کو

جیسے اک شیشے کی چادر ہو بچھی دور تلک
تم نے دیکھا ہے کبھی ٹھہرے ہوئے پانی کو

میں چلا اپنی قناعت کو لیے شام ڈھلے
تم تو روتے ہی رہو بیٹھ کے ارزانی کو

اور مہکے گی فضا راہِ یقیں کی ثاقبؔ
اور بھی بڑھنے دو اس وسعتِ امکانی کو

لو آج اپنی محبت کو عام کرتے ہیں
لو آج سارا ہی قصہ تمام کرتے ہیں

طنابِ عشق کو ہم بے لگام کرتے ہیں
یہی تو کارِ جنوں صبح شام کرتے ہیں

نجانے کتنی ہی سسیاں زمین دوز ہوئیں
اے ارضِ عشق تجھے ہم سلام کرتے ہیں

مرے وجود میں رہ کر بھی اُف نہیں کرتے
یہ سائے میرا بہت احترام کرتے ہیں

اسے اُجالوں سے رغبت تھی سو ملے اس کو
اب ہم بھی اپنا کوئی انتظام کرتے ہیں

یہ قصرِ عشق ہے اس میں رسائی ہے محدود
یہاں غلام ہی اکثر قیام کرتے ہیں

جہاں ہمارے سوا کوئی بھی نہ ہو ثاقبؔ
وہ ایسی شام ہمارے ہی نام کرتے ہیں

اک عجب سی روشنی ہے پھول پر
برف کی چادر بچھی ہے پھول پر

اے ہوائے صبح دھیرے دھیرے چل
ایک تتلی سو رہی ہے پھول پر

رات شبنم جانے کتنا روئی تھی
دن چڑھے تک بھی نمی ہے پھول پر

درمیاں کانٹوں کے شب بھر بیٹھ کر
اک غزل ہم نے کہی ہے پھول پر

باغ میں آمد خزاں کی کیا ہوئی
اک قیامت سی مچی ہے پھول پر

دیکھ لو کانٹوں بھرا بستر مرا
دیکھ لو یہ شاعری ہے پھول پر

عشق کا مبتلا کہاں نہ گیا
میں بھی تھا سر پھرا کہاں نہ گیا

میں بھٹکتا ہوا زمانے میں
لے کے حرفِ دعا کہاں نہ گیا

مانگنے والے ہم بنے ہی نہیں
اُن کا دستِ عطا کہاں نہ گیا

ورد بس ایک ہی رہا لب پر
نعرۂ مصطفٰےؐ کہاں نہ گیا

رقصِ وحشت میں کچھ خبر نہ رہی
اُس سے ہو کر جدا کہاں نہ گیا

عشق مدفون ہو گیا لیکن
ایک ٹوٹا گھڑا کہاں نہ گیا

جام و مینا تو اک بہانہ تھا
چھائی جب جب گھٹا کہاں نہ گیا

آسمانوں میں، ان زمینوں میں
ڈھونڈنا خود کو تھا کہاں نہ گیا

بجھ کے منزل اسے ملی، ورنہ
ایک جلتا دیا کہاں نہ گیا

دل میں موجود تھا مگر ثاقبؔ
اس کی پانے رضا کہاں نہ گیا

لفظ مانگے تو کبھی اس کے معانی مانگے
یہ سخن روز کوئی قصہ کہانی مانگے

اس کے عارض سے صبا مانگتی ہے شادابی
اس کے چلنے سے زمیں موجِ روانی مانگے

دل نے اک حشر بپا جسم میں کر رکھا ہے
ایسا کمبخت ہے کہ مَے بھی پرانی مانگے

پھر کوئی تازہ خطا مجھ سے ہوئی ہے سرزد
پھر یہ ماحول کوئی نقلِ مکانی مانگے

اس سے بڑھ کر کوئی اعجاز نہیں ہو سکتا
ایک پیاسے سے جو دریا کبھی پانی مانگے

دن میں ضد کرتا ہے دل ہاتھ میں سورج آئے
رات ہوتی ہے تو وہ رات کی رانی مانگے

جینے والوں کے لیے سارے ہی موسم ہوں گے
پینے والا تو فقط شام سہانی مانگے

چھین لی وقت نے جو تابِ سخن کیا کرتا
مجھ سے کیوں پھر وہی پہلی سی روانی مانگے

رت جو مہکی بہل گئے تم بھی
ایک پل میں بدل گئے تم بھی

تم تو پکے اصول والے تھے
دھوپ نکلی پگھل گئے تم بھی

مان تھا تم کو آئینے پہ بہت
دیکھ لو آج ڈھل گئے تم بھی

منزلوں سے تو خیر کیا شکوہ
راستوں میں پھسل گئے تم بھی

جس طرف فائدہ نظر آیا
اس طرف سر کے بل گئے تم بھی

دھوپ جھیلی تھی سارا دن میں نے
کیوں مگر گھر میں جل گئے تم بھی

سن کے ثاقبؔ غزل مری کل شب
دیکھا دیکھا مچل گئے تم بھی

جس جگہ اک راستہ دو راستے ہو جائیں گے
تیرے میرے درمیاں سو فاصلے ہو جائیں گے
کج کلاہانِ شریعت عشق سے ہیں ماورا
قیس مسجد میں گیا تو حادثے ہو جائیں گے

مرض بھی لا دوا نہ ہو جائے
کرب عقدہ کشا نہ ہو جائے

بے یقینی سی بے یقینی ہے
با خدا تُو خدا نہ ہو جائے

ڈر رہا ہوں کہ میرا سایہ بھی
نذرِ بادِ صبا نہ ہو جائے

ہجر لاحق ہے سو میں ڈرتا ہوں
تیرا ملنا دوا نہ ہو جائے

اس لیے ہم سفر رہا تیرا
زندگی! تو خفا نہ ہو جائے

عکس نے تو حصار کھینچ لیا
چُور اب آئینہ نہ ہو جائے

ترا مجھ پر اجارہ تو نہیں تھا
محبت تھی یہ سودا تو نہیں تھا

یقیں اپنی محبت کا ہو کیسے
وہ تھا خاموش، مانا تو نہیں تھا

گرا تھا ٹوٹ کے جو آسماں سے
وہ پتھر تھا ستارا تو نہیں تھا

سوا نیزے پہ سورج کا یہ آنا
قیامت کا اشارہ تو نہیں تھا

جنوں میرا تو چھو آیا تہوں کو
یہ بحرِ عشق گہرا تو نہیں تھا

صفِ دشمن سے تم مجھ کو نکالو
تمنا تھی، تقاضا تو نہیں تھا

ایک وحشت سی دکھائی دے رہی ہے آجکل
زندگی ہر پل دہائی دے رہی ہے آجکل
گھونسلہ آباد شاید پھر ہوا کہ اک صدا
گھر کے آنگن میں سنائی دے رہی ہے آجکل

نجانے کس کی انہیں لگ گئی نظر صاحب
بہت خفا ہیں مرے گھر کے بام و در صاحب

مصلیٰ عشق کا اور سجدہء جنوں دو پل
نماز اتنی نہیں ہوتی مختصر صاحب

ہم اپنے پاؤں کے چھالوں کا دھیان کیا رکھیں
ابھی ہے سامنے اک اور ہی سفر صاحب

یوں لگ رہا ہے کہ عنقا ہوئے زمانے سے
نظر ہی آتے نہیں صاحبِ ہنر صاحب

یقین کرتے ہیں ہر بات پر تری ثاقبؔ
کہاں سے لاؤ گے ہم جیسے معتبر صاحب

مہک گلوں کی تو بادِ صبا نہیں ہوتی
وطن سے دور وطن کی ہوا نہیں ہوتی

کسی کی آنکھ سے آنسو یہاں نہیں رِستے
کسی کے لب پہ کوئی التجا نہیں ہوتی

جو پا بجولاں ہیں ان کو خبر نہیں شاید
یہاں تو اپنی بھی کوئی صدا نہیں ہوتی

تم اپنے آپ میں تو با کمال ٹھہرے ہو
میں جانتا ہوں کہ تم سے خطا نہیں ہوتی

دعائیں ختم تو ہو سکتی ہیں پہ یاد رہے
عطا کی کوئی وہاں انتہا نہیں ہوتی

ہر ایک پانی تو زم زم نہیں ہوا کرتا
ہر ایک خاک تو خاکِ شفا نہیں ہوتی

یہی تو ماں کی عدالت کا فیض ہے ثاقبؔ
خطا کریں بھی تو کوئی سزا نہیں ہوتی

حجرہ ذات سمجھ لے تری وحشت کے سبب
ایک دن ذات سے ہم اپنی نکل جائیں گے

ہجر ہے، دھوپ ہے صحرا بھی ہے دیوانہ بھی
کتنا آسان ہے اب جاں سے گزر جانا بھی

اک طرف خواب مرے ایک طرف دنیا ہے
جاگنا بھی ہے مجھے نیند کو بہلانا بھی

گل کسی دشت کا ہو یا ہو کسی گلشن کا
جو کھلے یاد رہے اس کو ہے مرجھانا بھی

ایک دن حلقہ ء یاراں میں گزارو تو سہی
بھول جاؤ گے میاں لوٹ کے گھر جانا بھی

اب تو موجیں بھی نہیں آتی ہیں ساحل کے قریب
اب تو ہنستا ہے مرے شہر پہ ویرانہ بھی

جب بھی جانے کی کبھی اس سے اجازت مانگوں
ساتھ چل پڑتا ہے یارو مرے میخانہ بھی

یہ رویہ تمہیں جینے نہیں دے گا ثاقبؔ
دل دکھانا بھی مرا بعد میں پچھتانا بھی

یہ دوستی بھی عجب مرحلوں میں رکھتی ہے
جو مر مٹا ہے اسے قاتلوں میں رکھتی ہے

یہ بدگمانی بھی کس انتہا کی ہے ظالم
کمال فاصلے اپنے دلوں میں رکھتی ہے

کبھی گلاب کتابوں میں جو چھپاتی تھی
اب اپنے خواب سبھی فائلوں میں رکھتی ہے

میں عشق کرتا ہوں تو بے پناہ کرتا ہوں
تو کیوں حیات مجھے حاشیوں میں رکھتی ہے

میں اپنے آپ کا دشمن ہوں اور یہ عادت
اداس مجھ کو نئی منزلوں میں رکھتی ہے

ہر ایک روز نئے دوست ہیں نئے دشمن
مری انا مجھے کن الجھنوں میں رکھتی ہے

تمہیں خبر ہی نہیں میکشی ہے کیا ثاقبؔ
یہ شئے ہے وہ جو مجھے بادلوں میں رکھتی ہے

ترکِ فراق عجب ہے خوفِ وصال عجب ہے
حسنِ جمال ہائے ہائے اُف یہ حال عجب ہے

اس کا عروج عجب ہے، میرا زوال عجب
شاعر بہ ہوش عجب ہے بدمست حال عجب ہے

دل کا کہا تو بن گیا جاں کا کہا تو لٹ گیا
شعلہ بدست گلبدیں اس کا جمال عجب ہے

اس کا فراق جانفزا اس کا وصال دل نواز
وہ روز و شب تھے عجب ہے وہ ماہ و سال عجب ہے

میں بھی گنہ گار ہوں تم بھی گنہ گار ہو
ہائے شبِ فراق میں یہ احتمال عجب ہے

مجبور کر دیا گیا، محصور کر دیا گیا
لیکن سزا کے بعد وہ تیرا سوال عجب ہے

وقتِ وصال روبرو مجمعِ ستمگراں
اک رندِ بے مثال کی ثاقبؔ دھمال عجب ہے

فقط ہواؤں کی رفتار کا نہیں سوچو
یہ سوچنا ہے چراغوں میں جان ہے کتنی

ایک الجھن میں گرفتار ہوں اے یار مرے
کوئی پڑھتا ہے مرے سامنے اشعار مرے

گھر سے ہجرت کا چلو وقت قریب آیا ہے
مجھ سے اکتانے لگے ہیں در و دیوار مرے

دل کے نزدیک نہیں آ مرے اے عقلِ سلیم!
راستے عشق کے تو کرتی ہے دشوار مرے

خواہشوں کا ہے یہ انبار مرے قد سے بڑا
راستے سے کبھی ہٹتی نہیں دیوار مرے

میری پہچان بھی اب تو فقط اندیشہ ہے
قصرِ تاریخ نے سب کر دیے مسمار مرے

چند کانٹوں کے سوا کچھ نہیں رکھا میں نے
سارا گلشن ہی اٹھا لایا ہوں سرکار مرے

اپنے تیور جو سخن نے کبھی بدلے مجھ سے
رخ چھپائے ہوئے پھرتے ہیں خریدار مرے

خدا کا شکر بہت عافیت سے گزری ہے
کہ آج رات بڑی خیریت سے گزری ہے

ہمارا دن بھی تو کوئی کمال کر نہ سکا
ہماری شب بھی تو یکسانیت سے گزری ہے

میں عمر بھر کے لیے دل میں قید کرلوں گا
کہ تیری یاد میری سلطنت سے گزری ہے

سزا جزا کے علاوہ، تُو زندگی میری
یہ پہلے دیکھ کہ کس حیثیت سے گزری ہے

میں کیسے کہہ دوں یہ سانسیں بھی اک امانت تھیں
میں کیسے کہہ دوں کہ محرومیت سے گزری ہے

اسے گناہ سے تعبیر مت کرو ثاقبؔ
یہ خودکشی مری معصومیت سے گزری ہے

برکت دکھائی دینے لگی اتفاق میں
بس یہ ہوا تھا اہلِ سخن کے وفاق میں

ہم کیا ہماری مشقِ سخن کس حساب میں
اقبال، میر و ذوق بھی رکھے ہیں طاق میں

تو نے ہی تو گزاری نہیں شب مرے بغیر
میں بھی تو جاگتا رہا تیرے فراق میں

کب چاند آئے گا مری آنکھوں کی قید میں
شب کاٹ دی تھی دیکھنے کے اشتیاق میں

سوچا جو زندگی کو کبھی ہم نے ڈوب کر
کچھ بھی نہیں ملا تھا سیاق و سباق میں

سب اپنے اپنے صوبوں میں گم ہو کے رہ گئے
پہچان کب رہی ہے کسی کی وفاق میں

ملتا ہے اس کا تذکرہ قرآں میں بار بار
پھر کیسے ہم ہیں غرق بھلا اس نفاق میں

عجیب اہلِ سیاست کا یہ ہنر دیکھا
گِدھوں کو چھوڑ کے چڑیا کے پر کتر ڈالے

وحشتوں کا کمال موسم ہے
وصل ہے اور آنکھ بھی نم ہے

مجھ کو پانے کے بعد بھی جاناں
جانے اب تجھ کو کون سا غم ہے

زندہ رہنے کا یہ سبب بھی ہے
درد جتنا ملا ہمیں کم ہے

آسماں پر ملائکہ ہوں گے
جو زمیں پر رہے وہ آدم ہے

دن تو تنہائی میں کٹا اپنا
شب گزاری کو ایک عالم ہے

موسمِ جبر میں بھی تُو ثاقبؔ
شعر کہتا ہے، یہ ترا دم ہے

حاشیوں سے کبھی مفر نہ کیا
سچ کو پر ہم نے مختصر نہ کیا

تھا مکیں مجھ میں اور گھر نہ کیا
پھر بھی اس دل کو در بدر نہ کیا

سب تجھے پائمال کرتے رہے
زندگی میں نے ہی بسر نہ کیا

تم بھی میری طرح ہی پاگل تھے
تم نے بھی آج درگزر نہ کیا

اک تعلق جو رائیگاں ہی رہا
اک تعلق جو معتبر نہ کیا

کیا کریں اپنی بے رخی سے گلہ
گھر ملا جو اسے بھی گھر نہ کیا

مجھ کو میری ضرورتوں نے کبھی
ایک بیگانۂ ہنر نہ کیا

بس تماشہ بنے رہے شب بھر
ہم نے اندازۂ سحر نہ کیا

ڈوریوں میں گانٹھیں ہیں الجھنیں ہیں بندھن میں
کس نے بودیے کانٹے الفتوں کے آنگن میں

کیا سحر کی رعنائی کی کہانیاں لکھنا
فرق اب نہیں کوئی رہ نما و رہزن میں

بزمِ حسنِ جاناں کی اک یہی کہانی ہے
بس دیا ہی بجھتا ہے آندھیوں کی ان بن میں

کیا تلاش کرتے ہو جز تمہارے ہے بھی کیا
کیا چھپا کے رکھا ہے ہم نے اپنے دامن میں

زندگی تمہاری ہے سانس بھی تمہاری ہے
تم نے کہہ دیا الجھن ، دیکھ لو ہوں الجھن میں

کیا ہوا جو سب منظر ہیں دھواں دھواں ثاقبؔ
آگ لگ گئی ہوگی آج دل کے خرمن میں

محبت جس جگہ نہ ہو میں وہ گھر چھوڑ دیتا ہوں
بہت پیاسا بھی گر میں ہوں سمندر چھوڑ دیتا ہوں

کہا تھا تم نے ہی کہ عشق میں پاگل نہیں ہونا
چلو میں آج اپنا سوداو سر چھوڑ دیتا ہوں

اگرچہ مرحلہ مشکل بہت ہوتا ہے آنکھوں کو
سفر میں ساتھ نہ دیں ایسے منظر چھوڑ دیتا ہوں

انہی کو جوڑنے سے ہی نئی تصویر ابھرے گی
اٹھا لیتا ہوں شیشوں کو میں پتھر چھوڑ دیتا ہوں

اسی امید پر آئے جو شب تو ڈر نہیں جائے
میں اپنے گھر کو بھی اکثر منور چھوڑ دیتا ہوں

عجب زنداں کا اب تو خوف رہتا ہے مجھے ثاقبؔ
پکڑتا ہوں پرندوں کو تو ڈر کر چھوڑ دیتا ہوں

مجھ کو بیگانہ کہا جب کسی سودائی نے
مسکرا کر مجھے دیکھا مری دانائی نے

وصف تھا اُس کا کہ جب پھول کسی نے توڑا
اپنے سر لی سبھی تہمت گلِ رعنائی نے

دور بجتی ہوئی اک دھن تھی کہ دل کٹ ہی گیا
یاد کیا کچھ نہ دلایا مجھے شہنائی نے

میرے اشعار مرا نام لیے پھرتے رہے
میرا پیچھا نہیں چھوڑا مری رسوائی نے

میں بھی منہ موڑ کے بیٹھا رہا خاموشی سے
یوں تو آواز بہت دی ہے مجھے سچائی نے

میں کسی منظرِ بیباک پہ لکھتا لیکن
مجھ کو مہلت ہی نہیں دی میری بینائی نے

میں کہ شوریدہ سروں میں بھی ثاقبؔ تھا شمار
ضد پہ مجبور کیا مجھ کو شکیبائی نے

دل و نظر میں تماشہ تو روز ہوتا ہے
نیا ہے کیا، یہ خرابہ تو روز ہوتا ہے

وہ آکے پھر نیا قصہ سنائے گا مجھ کو
کہ اس کے پاس بہانہ تو روز ہوتا ہے

سوال یہ ہے کہ منزل بھی کیا اسی پر ہے
ہمارے سامنے رستہ تو روز ہوتا ہے

کبھی ستارے کبھی چاند تو کبھی سورج
ترے مکان پہ پہرا تو روز ہوتا ہے

وہ خوش خرام یہیں سے گزرتی رہتی ہے
مری گلی میں اجالا تو روز ہوتا ہے

میں اپنے چہرے پہ خوشیاں سجائے رکھتا ہوں
مرے دکھوں کا ازالہ تو روز ہوتا ہے

یہ بحر چھان کے نکلوں گا ایک دن ثاقبؔ
مرے لیے یہ کنارہ تو روز ہوتا ہے

اُسی سے پھر بھی ہمیں آسرا تھا کیوں آخر؟
وہ اک زمانے سے روٹھا ہوا تھا کیوں آخر؟

میں کچھ بھی کہہ نہیں پایا اسے سرِ محفل
سلام اس نے مجھے ہی کیا تھا کیوں آخر؟

کتاب اس نے لکھی دوستوں پہ اک اپنے
ہمارے نام پہ اک دائرہ تھا کیوں آخر؟

وہی ہے وصل وہی ہجر اور وہی باتیں
وہی پرانا عجب سلسلہ ہے کیوں آخر؟

سمجھ میں آتا نہیں بخت چاہتا کیا ہے
یہ بات بات پہ اب روٹھتا ہے کیوں آخر؟

ابھی بھی چاندنی میں ہے منتظر کس کا
ابھی بھی آئینے سے رابطہ ہے کیوں آخر؟

سمجھ رہا تھا کہ منزل پہ آ گیا ثاقبؔ
تو میرے سامنے یہ راستہ ہے کیوں آخر؟

ابھی تو درد کو انبار ہوتے دیکھنا ہے
غبارِ دشت کو دیوار ہوتے دیکھنا ہے

میں اپنے ضبط کو بھی آزمانا چاہتا ہوں
مجھے یہ شہر بھی مسمار ہوتے دیکھنا ہے

ابھی تو عشق کی بس ابتدا ہوئی ہے یہاں
وفا کی راہ کو پرخار ہوتے دیکھنا ہے

تو میرے رنگ میں اترے تو کوئی بات بنے
تری شبیہ کو شہکار ہوتے دیکھنا ہے

ابھی تو شہر کی پہلی سڑک سے گزرا ہے
ابھی سیلاب کو اُس پار ہوتے دیکھنا ہے

جبھی تو آئینہ اک لا کے رکھ لیا میں نے
کہ خود کو عشق میں بیمار ہوتے دیکھنا ہے

میں اپنے صبر کی سرحد کو پار کر لوں گا
کہ دل کو جسم سے بیزار ہوتے دیکھنا ہے

سہیلؔ شاعروں کا پیر ہے ولی بھی ہے
اسی کو صاحبِ دربار ہوتے دیکھنا ہے

گل و بلبل کلی کوئی تو آئے
مہک یا روشنی کوئی تو آئے

اکیلا پن مجھے ڈسنے لگا ہے
شناسا ، اجنبی، کوئی تو آئے

وہ خود ہو یا ہوا اس کی یاد کوئی
مجھے لینے کبھی کوئی تو آئے

یہ تنہائی نظر کو چبھ رہی ہے
وہ چاہے ہو نمی کوئی تو آئے

اگر ہے دور منزل اپنی ثاقبؔ
مقامِ عارضی کوئی تو آئے

چشمِ حیرت بنی داستانِ غزل
اللہ اللہ دیکھو یہ شانِ غزل

بانکپن دیکھتا رہ گیا آج بھی
روبرو ہے مرے امتحانِ غزل

خال و خد میں چھپی نغمگی باخدا
لکھ نہ جاؤں کہیں اس کو جانِ غزل

لفظ قرطاس پر جگمگانے لگے
ثبت ہوتی رہی داستانِ غزل

اب فصیلِ نظر کوئی پہرہ نہیں
ہے سخن میں سبھی پاسبانِ غزل

چھنچھناتی رہی شاعری رات بھر
اس کو پڑھتے رہے ناقدانِ غزل

جیسے پودا شجر میں بدلتا ہوا
خال و خط سے اٹھا ہے نشانِ غزل

میٹھا میٹھا ہر اک رنگ تصویر میں
میٹھی میٹھی لگی ہے زبانِ غزل

بوجھ ہر شخص کو اس روز بھی ڈھوتے دیکھا
ہم نے تو عید کو پردیس میں روتے دیکھا

دل سے جب بھی کبھی محبت کی
عقل بولی بڑی حماقت کی

کیسے خود کو سنبھال پاؤں گا
شعر نے گر کہیں بغاوت کی

خلوتِ جاں میں رقص جاری تھا
رات گزری بڑی قیامت کی

لہجۂ درد کاٹ دیتا ہے
جانتے ہو زبان وحشت کی

زخم ملتے رہے سدا اور ہم
داد دیتے رہے سخاوت کی

تجربہ زندگی کا ہے اتنا
دو گھڑی عشق پھر عداوت کی

ظالموں زور سے گلا گھونٹو
جان نکلی کہاں معیشت کی

خود کو مقتل میں کھینچ لایا ہوں
انتہا ہے مری شرافت کی

عقل بس سوچتی رہی ثاقبؔ
دل نے بڑھنے کی کچھ جسارت کی

جام بھی تھا ساقی بھی اور رتجگا بھی تھا
اپنے ڈگمگانے کا سارا سلسلہ بھی تھا

خود ہی روک رکھا تھا اپنا ہر قدم ورنہ
آسماں کو چھونے کا ہم میں حوصلہ بھی تھا

اس طرح جدا ہونا قسمتوں میں تھا شاید
ورنہ فاصلہ سارا میری خاکِ پا بھی تھا

آ گئے تھے ہم اٹھ کر بزم سے مگر اس کے
خوشبوئے بدن کا کچھ ساتھ ذائقہ بھی تھا

کون سی کشش تھی وہ جس نے دل ہلا ڈالا
اجنبی تھا وہ لیکن اپنا سا لگا بھی تھا

کمرہ ءِ سیاست میں، قوم کی حمایت میں
سانپ تو بہت سے تھے ایک اژدہا بھی تھا

ریگِ دل کی الجھن میں ہم پھنسے رہے ورنہ
بحرِ عشق سے یارو ایک راستہ بھی تھا

ٹوٹنا تو تھا مجھ کو نام تھا مرا ثاقبؔ
کس نے کہہ دیا تم کو میں کبھی جُڑا بھی تھا

اُفق کے پار سے یا تُو زمیں کی تہہ سے نکال
غزل سجانی ہے تو ڈھونڈ کے لا حسنِ خیال

بدل بھی سکتی ہے قسمت دعاؤں سے تیری
نصیب کا ہے یہ سکہ ذرا یقیں سے اچھال

نہ جینے دیتے ہیں ہم کو نہ مرنے دیتے ہیں
عجیب خواب ہیں اپنے تو خواہشیں بھی کمال

در و دیوار نے کھینچا ہوا ہے ایسا حصار
کوئی جواب ندارد نہ کوئی آئے سوال

بس اتنی خود سے شکایت رہی سدا مجھ کو
کوئی کسک ہے دلِ ناتواں کو اور نہ ملال

جو لڑکھڑائے ترے پیر تو جیے گا نہیں
یہ راہِ عشق ہے ثاقبؔ دل و نظر کو سنبھال

یوں بھی کیا کہ عشق کا ہر مسئلہ کچھ بھی نہ تھا
رابطہ تو تھا بہت پر سلسلہ کچھ بھی نہ تھا

پھر بھی سارا شہر کیوں خاموش تھا سنسان تھا
کوئی بلوہ، کوئی جھگڑا، حادثہ کچھ بھی نہ تھا

جانے کیوں اس کی نظر میں پھر بھی ہم مجرم رہے
کوئی شکوہ و شکایت یا گلہ کچھ بھی نہ تھا

تھا کوئی میرے سوا بھی میرے کمرے میں مگر
بارہا دیکھا مگر ثاقبؔ ملا کچھ بھی نہ تھا

آئے پیغامِ نظر کوئی حوالہ بن کر
عکس اترے تو مری آنکھ میں چہرہ بن کر

کوئی زنجیر مجھے اب نہیں کر سکتا ہے
آتشِ شوقِ جنوں بھڑکی جوالہ بن کر

اشک ہی جبکہ مری چشمِ گریزاں میں رہے
کیسے دیکھوں میں تجھے دیکھنے والا بن کر

میرا معیارِ ملاقات بشر جیسا ہے
مجھ سے ہرگز نہ ملیں آپ فرشتہ بن کر

ہر ستارہ درِ مہتاب پہ کب آتا ہے
ہر کوئی آتا نہیں پاس شناسا بن کر

شاید اک خواب ہی ہوگا وہ ہمارا یارو
کب کہا اس نے رہے گا وہ ہمارا بن کر

منزلیں ایک، ہدف ایک تو ڈرنا کیسا
میں ترے ساتھ چلوں گا ترا سایہ بن کر

میں بھی یوسف کی طرح بکنے لگا ہوں آخر
کاش آجائے یہاں تو بھی زلیخا بن کر

کل ہی سورج نے میرا ساتھ دیا تھا ثاقبؔ
شام پھر اُبھری مرے دن سے دریچہ بن کر

بھیجا ہے ترکِ عشق کا اس نے مجھے حساب
تھا منتظر جواب کا لو آ گیا جواب

دل کی کہانیاں تھیں تپش سے بھری ہوئی
جلتا ہوا سخن تھا، جلاتے رہی کتاب

وہ معرکہ تھا عشق کا سوچا نہیں کبھی
کس کو شکست ہوگئی، تھا کون کامیاب

حائل ہے کچھ نہ کچھ تو زمیں آسماں کے بیچ
اب تک کسی وجود پر اترا نہیں عذاب

وحشت ہے، تیرہ رات ہے اور ایک میں
اس ہجر کا فسوں بھی کبھی دیکھیے جناب

دیکھا نہیں پلٹ کے انہیں میں نے عمر بھر
بیتا ہوا وہ پل ہو کہ چھوڑی ہوئی شراب

کب حق ملے گا اہلِ صفا کو مرے خدا
کب آئے گا جہان میں وہ یومِ احتساب

حیرت ہے سو رہے ہیں مقدر کے بام و در
ٹوٹے گا کب حجاب، یہ اٹھے گا کب نقاب

رستے بھی اعتماد کے قابل نہیں رہے
رک سے گئے ہیں نقشِ کفِ پا پہ سب سراب

یہ نئی کوئی واردات ہے کیا
سامنے پھر مرے فرات ہے کیا

میں اسے دن سمجھ کے بیٹھا ہوں
جانِ میری بتا یہ رات ہے کیا

دکھ مسلسل سما گئے مجھ میں
بے ثباتی میں بھی ثبات ہے کیا

یہ بتا دے ذرا مرے مالک
سوچ مری بھی شش جہات ہے کیا

تم نمٹ آئے ہو زمانے سے
اب نشانے پہ مری ذات ہے کیا

حوصلے پست ہو نہ جائیں مرے
عشق بھی کوئی سومنات ہے کیا

اختلافِ سخن تو لازم ہے
کیا تری بات نئی بات ہے کیا

تشنہ آنکھوں سے لمس عارض تک
بس یہی میری کائنات ہے کیا

زندگی کی بساط پر ثاقبؔ
عشق ہو جائے تو یہ مات ہے کیا

ثاقب کتابِ عشق ہے دل سے پڑھا کرو
منزل کی گر طلب ہے تو رستے پڑھا کرو

آوارگانِ شب کرو ایسا بھی تم ضرور
شب سے نظر چرا کے دریچے پڑھا کرو

اس نے تمام شب میرے قرطاسِ چشم پر
تحریر کر دیے ہیں جو سپنے پڑھا کرو

تہذیب کے دیے کو جلانے سے پیشتر
چلتی ہوئی ہوا کے اشارے پڑھا کرو

ہر موج کر رہی ہے رقم ریت پر فسوں
اس جستجو میں ہو تو کنارے پڑھا کرو

وحشت ہو، عشق ہو کہ سیاست ہو ان دنوں
آنکھیں پڑھا کرو یہاں چہرے پڑھا کرو

اس زندگی نے جو بھی سکھایا غلط نہیں
اترے ہیں عرش سے جو صحیفے پڑھا کرو

ثاقب کتابِ عشق کا سادہ اصول ہے
جیسے لکھا کرو اسے ویسے پڑھا کرو

آنکھوں سے کبھی دل میں اترتے ہی نہیں لوگ
کیا ظلم ہے کہ دل میں دھڑکتے ہی نہیں لوگ

بس اتنی کہانی ہے کہ اس ظلمتِ شب میں
بچھڑے ہی چلے جاتے ہیں رکتے ہی نہیں لوگ

کیا ظرف ہے اس شہرِ خرد کا بھی عزیزو
حیرت ہے کوئی بات سمجھتے ہی نہیں لوگ

اس عشق میں رائج ہی نہیں کارِ تساہل
انجام ہے کیا اس کا سمجھتے ہی نہیں لوگ

اک خوف لگا رہتا ہے گر جائیں گے پل میں
اب پکے مکانوں میں بھی رہتے ہی نہیں لوگ

بس اپنی ہی دنیا میں ہر اک جینے لگا ہے
نیرنگیٔ دوراں سے الجھتے ہی نہیں لوگ

خوشبو کو بھی مٹھی میں چھپا لیتے ہیں ثاقبؔ
گل جیسے نکھرتا ہے نکھرتے ہی نہیں لوگ

برا مناتے ہو کیوں، تم نے کچھ سنا بھی نہیں
ابھی تو ہم نے کوئی واقعہ کہا بھی نہیں

ابھی سے خواہش و داماں کا تذکرہ کیسا
ابھی تو آنکھ سے آنسو کوئی گرا بھی نہیں

ابھی سے شہر میں افسردگی ہے کیوں جانے
ابھی تو دل کا کوئی داغ تک جلا بھی نہیں

خیالِ یار نے الجھا کے رکھ دیا مجھ کو
قلم چلا بھی نہیں اور پھر رکا بھی نہیں

جنونِ عشق کو منزل کا علم کیا ہوتا
یہ وہ سفر ہے، کوئی جس کا رہنما بھی نہیں

حسد پرستوں نے گھر دن میں دیکھ رکھا تھا
ہوئی جو شام، کہیں پر دیا جلا بھی نہیں

گرے جو عرشِ وفا سے تو یہ ہوا معلوم
سوادِ شب میں کہیں کوئی آسرا بھی نہیں

شکست دل نے کہیں مان لی نہ ہو ثاقبؔ
گزشتہ دن کی طرح معرکہ ہوا بھی نہیں

اس خرابے نے ہمیں زیر و زبر جانا ہے
بس اسی خاک میں بے فیض بکھر جانا ہے

ہم توانا ن ہیں، شہ زور بھی ہیں، باغی بھی
زندگی تُو نے ہمیں لقمہء تر جانا ہے

مسئلہ میرا ہے سو علم ہے ساحل کا مجھے
کب کہاں کیسے مجھے پار اُتر جانا ہے

پیرہن اوڑھنے والا ہے فلک بھی اب کے
تم بھی گھر جاؤ میاں مجھ کو بھی گھر جانا ہے

کچھ تو چھلکے گا لرزتے ہوئے ہاتھوں میں مرے
جانتا ہوں کہ ہر اک جام کو بھر جانا ہے

یہ قواعد کی کتابوں میں کہیں لکھا نہیں
اپنے لکھے ہوئے اشعار سے ڈر جانا ہے

زندگی ایسے سفر میں ہی گزاری اپنی
جس نے سایہ نہ دیا اس کو شجر جانا ہے

دل جلانا تو کبھی دل کو دکھانا سیکھا
اس نے تو عشق کا ہر ایک بہانہ سیکھا

ہم نے پستی کی طرف مڑ کے نہیں دیکھا کبھی
ہم نے تو اپنے سدا قد کو بڑھانا سیکھا

کب کہا میں نے کہ یہ زخم عطا ہیں تیری
زندگی میں نے فقط ساتھ نبھانا سیکھا

اس زمیں پر کبھی چلنے کا سلیقہ جانا
آسماں سر پہ کبھی ہم نے اٹھانا سیکھا

اُس کو توفیق نتائج سے گزرنے کی نہیں
جس نے تاریخ سے بس آگ لگانا سیکھا

صبح کو شام سے اور شام کو پھر صبح سے
بانٹنے میں ہی سدا ہم نے گنوانا سیکھا

خواہشوں کے بھرے بازار سے کیا پایا ہے
کون کہتا ہے یہاں ہم نے کمانا سیکھا

الجھ پڑوں نہ کہیں تجھ سے عالمِ وحشت!
مجھے سنبھال لے میں خواب لے کے جاگا ہوں

خلوتِ عشق کے آداب سمجھنے والے
اب نظر آتے نہیں خواب سمجھنے والے

ایک پتھر ہوں فقط اور تو میں کچھ بھی نہیں
تجھ پہ صدقے مجھے نایاب سمجھنے والے

پاس آ بیٹھ ذرا آ گ کے پہلو میں کبھی
میں حقیقت ہوں مجھے خواب سمجھنے والے

ایسے تو کتنے ہی ہر روز میں پی جاتا ہوں
چشمِ نم دیدہ کو سیلاب سمجھنے والے

چل مرے ساتھ ذرا زخم شماری کر لے
صحنِ گل کو مرے شاداب سمجھنے والے

وہ کہاں رتبہ سراجوں کا سمجھ پائیں گے
اپنی پستی کو ہی مہتاب سمجھنے والے

مانتے ہوں گے کہاں لعل و گہر کو ثاقبؔ
اپنی دنیا کو تہِ آب سمجھنے والے

ایک بے چینی سی در آئی مری حشت میں
اس کی پھر یاد اُتر آئی مری وحشت میں

ڈھونڈنے خود کو میں نکلا تھا، ملا کچھ بھی نہیں
مجھ کو وحشت ہی نظر آئی مری وحشت میں

میں نبھانے کو نبھا لیتا ترے وعدے سبھی
کیا کروں ضد تھی کہ دَر آئی مری وحشت میں

تمکنت مجھ کو پریشان کیے رکھتی ہے
شخصیت ایسے نکھر آئی مری وحشت میں

تیری بانہوں میں سمٹ آیا ہوں بے بس ہو کر
چاندنی جیسے سنور آئی مری وحشت میں

کیسی امید لیے، کتنے نئے خواب لیے
میری تعبیر بھی در آئی مری وحشت میں

اس سمندر کے لیے دریا نہیں ہونا کبھی
زندگی کے ساتھ سنجیدہ نہیں ہونا کبھی

وقت دیمک کی طرح سے چاٹ جائے گا تمہیں
آئینے کے واسطے چہرہ نہیں ہونا کبھی

میں نے تو اتنا کہا تھا خواب مت دیکھا کرو
میں نے تم سے کب کہا فردا نہیں ہونا کبھی

مار ڈالے گی ریاضت عشق کی یہ جان لو
پتھروں کے سامنے شیشہ نہیں ہونا کبھی

دشمنی مہنگی پڑی بادل سے آخر تم کو بھی
میں نہ کہتا تھا تمہیں صحرا نہیں ہونا کبھی

بس ایک کمرہ مرا اس میں وحشتوں کا سفر
کمالِ فن سے کٹا ہے ریاضتوں کا سفر

کہاں ملی ہے مجھے فرصت کہ خود کو سن پاتا
خموش ہی رہا مجھ میں سماعتوں کا سفر

تم اس سفر میں کبھی خوش گماں نہیں رہنا
کہیں کا رکھتا نہیں ہے محبتوں کا سفر

بس ایک میں ہی نہیں دشتِ کوئے امکاں میں
کہ روشنی کا بھی جاری ہے حیرتوں کا سفر

شکن بہ صورتِ موجِ بحر ہر اک چہرہ
ہے جیسے سیلِ مسلسل ملامتوں کا سفر

کہیں تو عشقِ جنوں رنگ لائے گا اپنا
کہیں تو ٹھہرے گا اس کی عداوتوں کا سفر

ہنوز سامنے حکمت کا ایک سمندر ہے
ہنوز کرنا ہے ہم کو حکایتوں کا سفر

حیات تا بہ عدم خواہشوں کا رستہ ہے
مسافروں پہ ہے لازم قناعتوں کا سفر

سنبھل سنبھل کے بڑھانا قدم ذرا ثاقبؔ
ہٹا بھی سکتا ہے منزل سے عجلتوں کا سفر

اب تو یارو زندگی کچھ دم کی ہے
اس دیے میں روشنی کچھ دم کی ہے

بدگمانی سر اُٹھانے لگ گئی
اب ہماری دوستی کچھ دم کی ہے

درد ہے کچھ زادِ راہ اور ان کہی
دوستو یہ شاعری کچھ دم کی ہے

ہوگئی خاموش وہ سن کر مجھے
جانتی ہے برہمی کچھ دم کی ہے

دھڑکنوں کا شور تھم جانے کو ہے
منتظر دل! بے کلی کچھ دم کی ہے

ضبط اپنی انتہا کو آ گیا
اپنی آنکھوں میں نمی کچھ دم کی ہے

فیصلہ کر ہی لیا ہے آخرش
اس کی آنکھوں میں نمی کچھ دم کی ہے

چائلڈ لیبر ڈے

چھالے تھے جنہیں دیکھ کے کہنے لگا بچہ
بابا مرے ہاتھوں میں ستارے تو نہیں ہیں

کبھی نظر میں کبھی دل میں جاگتا ہی رہا
کسی کی یاد کا منظر کہیں سجا ہی رہا

شکست کھا کے بھی اس کو انا تھی اپنی عزیز
میں جنگ جیت کے بھی طالبِ دعا ہی رہا

تمام عمر گزاری تھی آئینوں میں مگر
مزاج اپنا سدا سنگ آشنا ہی رہا

کٹی ہے عمر فقط خواہشوں کے جنگل میں
مرے لبوں پہ فقط حرفِ مدعا ہی رہا

کسی بھی کرب کی تشکیل مجھ سے ہو نہ سکی
سخن کے ہاتھ میں بے فیض رتجگا ہی رہا

ہر ایک عشق زدہ سوچتا رہا ہے یہی
وہ بے وفا ہی سہی میں تو باوفا ہی رہا

اڑان عشق کی لیتے ہوئے جو ڈرتا تھا
وہ کھو گیا تھا خلا میں، مَیں ڈھونڈتا ہی رہا

مری محرومیوں کو جب ضرورت گھیر لیتی ہے
قناعت جاگ اٹھتی ہے تو ہمت گھیر لیتی ہے

کہاں تک اپنے پر پھیلاؤں گا میں ان فضاؤں میں
بلندی چاہے جتنی ہو یہ وسعت گھیر لیتی ہے

مسائل زندگی کے دائروں میں قید ہیں تو پھر
یہ کیوں ہر اک فراغت میں مصیبت گھیر لیتی ہے

پلٹ آتا ہوں اپنی بے بسی کو ساتھ لے کر میں
تری محفل سے اٹھتا ہوں تو وحشت گھیر لیتی ہے

کھلونے دور ہوتے جا رہے ہیں اب نگاہوں سے
مرے شوقِ طلب کو ان کی قیمت گھیر لیتی ہے

کبھی جانا نہیں شوریدہ سر لوگوں کی محفل میں
خردمندوں کو دنیا کی حماقت گھیر لیتی ہے

مری بینائی میں تیرے مناظر رقص کرتے ہیں
مری تنہائی کو تیری سماعت گھیر لیتی ہے

حال پہ بات کر احوال پہ تنقید نہ کر
بات اس لمحے کی ہے، سال پہ تنقید نہ کر

یہ تو بازار ہے بس دیکھ نکل جا آگے
تو کسی کے بھی خد و خال پہ تنقید نہ کر

کیوں کسی شک کو جگہ خانۂ دل میں دی تھی
آئینے کی ہے خطا بال پہ تنقید نہ کر

تُو سخن فہم سہی، اتنی گزارش ہو قبول
میرے کردار پہ اعمال پہ تنقید نہ کر

رخ ہواؤں کا مخالف ہے سمندر بے کل
کچھ نہ ہاتھ آیا ہے تو جال پہ تنقید نہ کر

گر چھلکتا ہے تو پیالے کی خطا ہے ثاقبؔ
ظرف کو دیکھ تو سیال پہ تنقید نہ کر

کس لیے اتنی بھلا آہ وفغاں، جانے دے
عشق تو عشق ہے اے جانِ جہاں، جانے دے

میں بھی اس معرکۂ ضبط کا پیادہ ہوں ابھی
میری سن لیں گے مرے ہم نفساں، جانے دے

گمرہی گر ہے نصیب درِ امکان تو پھر
اے مری جانِ غزل، مہرِ زماں جانے دے

لگ گیا زنگ نئی سوچ کے ایوانوں میں
کس کی بنیاد سرِ سود و زیاں، جانے دے

جو سمجھ میں ترے آ جائے سخن لکھ ویسا
شعر کہنے کے لیے فکر و بیاں، جانے دے

ہاتھ میں جام لیے آنکھ میں کچھ خواب لیے
اب کے دہلیز پہ مت روک نہاں جانے دے

آ کسی اور جگہ بیٹھ کے دم لیتے ہیں
اس شجر پر ہیں محبت کے نشاں، جانے دے

چاہے منفی ہی رویہ ہو تمہارا ثاقبؔ
اپنے ایقاں کو لیے قصرِ گماں جانے دے

اپنی دنیا میں، خیالوں میں جیا کرتے تھے
ہم تو وہ تھے کہ جو خوابوں کو بُنا کرتے تھے

وہ جوانی کا تقاضا تھا جنوں کے دن تھے
عقل کی ہم نہیں بس دل کی سنا کرتے تھے

بس یہ کافی تھا بتانے کو شب و روز اپنے
ہم کتابیں تو نہیں، چہرے پڑھا کرتے تھے

اب کہاں کھو گئے وہ صاحب دستارِ جنوں
منصبِ عشق پہ فائز جو رہا کرتے تھے

اب کہاں صبر وہ پہلے سا کہ ہم تو شب بھر
کھیل ہی کھیل میں تاروں کو گنا کرتے تھے

بے پر و بال نظر آتے ہیں جو آج ہمیں
یہ پرندے بھی ہواؤں میں اُڑا کرتے تھے

آج جو طاق پہ رکھے ہیں دیے وہ پہلے
شام ڈھلتی تھی تو محفل میں جلا کرتے ہیں

اک تسلسل میں کٹا وقت جو اپنا ثاقبؔ
شب کبھی دن سے تو دن شب سے ملا کرتے تھے

ملیں گے جب وہ تمہیں بام و در اداسی میں
تو کیسے جاؤ گے تم اپنے گھر اداسی میں

کمال ہے شبِ ہجراں تجھے خبر نہ ہوئی
بلا کے شعر ہوئے رات بھر اداسی میں

چلا گیا ہے مسافر تو کاٹ کر دو پل
تمام عمر رہے گا شجر اداسی میں

ترے وصال کا جو تذکرہ چمن میں رہا
سو لطف آیا بہت رات بھر اداسی میں

یہ سانحہ بھی مرے ساتھ ہی کیوں ہونا ہے
کہ تم بھی آتے نہیں ہو نظر اداسی میں

کہاں سے لاتے خوشی کوئی ساتھ ہم اپنے
کٹا ہے اپنا تو سارا سفر اداسی میں

عجیب رات ہے جو رات سی نہیں لگتی
سحر بھی لگتی نہیں ہے سحر اداسی میں

فریب چشمِ تماشا کا ہی نہیں ثاقبؔ
حسین لگتے ہیں اہلِ ہنر اداسی میں

تم ستم کرتے ہو کوئی نہ کرم کرتے ہو
جب بھی ملتے ہو مرا ناک میں دم کرتے ہو

لو میں حاضر ہوں مگر سوچ لو اتنا پہلے
ہاتھ اپنے ہی مرے بھائی قلم کرتے ہو

میں بھی جی پاتا نہیں تم بھی ہو سہمے سہمے
دوریاں خود ہی بڑھاتے ہو ستم کرتے ہو

میری آنکھوں کے سبھی خواب بکھر جاتے ہیں
جاتے جاتے میری آنکھوں کو جو نم کرتے ہو

موج سے رسمِ تعلق ہے، بغاوت ہے، یا کیا ہے
کیوں مرے نام کو پانی پہ رقم کرتے ہو

سبز جھیلوں کے کنارے پر دمِ آخر کیوں
سرخ آنچل کو محبت کا علم کرتے ہو

گزرے موسم کی بھلا آس بھی کیوں ہو ثاقبؔ
جانے والے کا بھلا کس لیے غم کرتے ہو

پا بہ زنجیر کھڑے ہیں ترے دربار میں ہم
یعنی چنوا ہی دیے جائیں گے دیوار میں ہم

کوچۂ درد سے خاموش گزر جاتے ہیں
عزتِ نفس کو رکھے ہوئے دستار میں ہم

عشق کیا ہم نے ہی دنیا میں کیا ہے یارو
ہیں گلوں میں کبھی رسوا تو کبھی خار میں ہم

ہم کو موسم کی، کسی رُت کی خبر ہی نہ ہوئی
عمر بھر الجھے رہے درہم و دینار میں ہم

اپنی قیمت کا تعین بھی نہیں کر پائے
بس یونہی ٹھہرے رہے کوچہ و بازار میں ہم

جو بھی لکھا ہے اسے دل سے نبھایا بھی ہے
مصلحت رکھتے نہیں ہیں کبھی معیار میں ہم

زندگی روز میسر نہیں ہوتی ثاقبؔ
اتنے پاگل نہیں مر جائیں ترے پیار میں ہم

میں محبت کی بات کرتا ہوں
تم عقیدت پہ جا کے رکتی ہو

اک دوسرے سے لگتا ہے بیزار سبھی ہیں
اس حلقۂ برتر میں کیا بیمار سبھی ہیں

کشکول بکف ہو کے بھی خوددار ہیں مگر
اس جرمِ فقیری کے سزاوار سبھی ہیں

گرتی ہوئی دیوار سے ہر اک ہے گریزاں
اُٹھتی ہوئی دیوار کے معمار سبھی ہیں

اک ہم ہی نہیں حلقۂ حیرت میں اکیلے
اس چشمِ گریزاں کے طرفدار سبھی ہیں

کیا سوچ کے منزل کا تعین کوئی کرتا
سایہ نہیں دیتا کوئی دیوار سبھی ہیں

اک شخص بھی حالات کی خبریں نہیں رکھتا
ویسے تو مرے شہر میں اخبار سبھی ہیں

یہ بزمِ سخن فہم تو خوش کن ہے بہت ہی
لگتا ہے یہ ثاقبؔ کہ ثمر بار سبھی ہیں

ہر کرن آس کی آنکھوں سے چھپا دی گئی کیا
روشنی پر کوئی تعزیر لگا دی گئی کیا

رات بھر ایک بھی ہچکی نہیں آئی مجھ کو
میری تصویر سرہانے سے ہٹا دی گئی کیا

تم جو لوٹے ہو سمندر کے سفر سے تو کہو
وہ جو بستی تھی برابر میں مٹا دی گئی کیا

پھر تعلق کو نئی ٹھیس لگی ہے شاید
درمیاں پھر کوئی دیوار اٹھا دی گئی کیا

جس میں آشفتہ سری چاٹ گئی میرا وجود
وہ کہانی بھی تجھے آج سنا دی گئی کیا

لمحہ لمحہ جو گزرتا ہے قیامت کی طرح
میرے حصے کی شبِ ہجر بڑھا دی گئی کیا

سن رہا ہوں کہ ہوا آئے گی جزیہ لینے
گھر کی دہلیز چراغوں سے سجا دی گئی کیا

آسماں راکھ کے ملبوس میں لپٹا ہوا ہے
میرے تابوت میں پھر آگ لگا دی گئی کیا

خود کلامی میں لکھی تھی جو محبت کی کتاب
خود کلامی میں ہی ثاقبؔ وہ جلا دی گئی کیا

میرؔ کے شعر کو سینے سے لگائے ہوئے تم
اچھے لگتے ہو محبت کو سمجھتے ہوئے تم

وہم و ادراک، گماں، شک کی سبھی تاویلیں
میں تمہیں اور مجھے اتنا پرکھتے ہوئے تم

کتنے ہمدرد لگے شام کی وحشت میں مجھے
اپنے دامن میں مرے غم کو سمیٹے ہوئے تم

جیسے خوش رنگ لبادوں میں رواں موسمِ گل
کسی تتلی پہ سرِ شاخ لپکتے ہوئے تم

خوش گمانوں کی مثلث پہ ہنسی آتی ہے
میرا ساغر، مری تنہائی، سنبھلتے ہوئے تم

خود لکھو خود ہی پڑھو خود ہی جلاؤ بھی انہیں
اپنے لکھے ہوئے اشعار سے سہمے ہوئے تم

میرے اطراف بکھرتا ہوا یہ گنجِ سخن
اور بے ساختہ اس بھیڑ میں الجھے ہوئے تم

دھیرے دھیرے مری سانسوں کا جدا ہو جانا
رفتہ رفتہ مرے ہاتھوں سے سرکتے ہوئے تم

ہم کو تو راس ہے سناٹوں میں رہنا ثاقبؔ
اچھے لگتے نہیں تنہائی میں ڈوبے ہوئے تم

وصل کی امید میں کتنے ستارے جاگتے
پا بجولاں موج آتی تو کنارے جاگتے

اس کی خواہش تھی مراسم ٹوٹنے کے بعد بھی
شاعری کے بام پر سب استعارے جاگتے

تم نے تو محصور کر ڈالا مرے ہر خواب کو
بن کسی تعبیر کے بھی کیا اِشارے جاگتے

سر اٹھا کے تم کو بھی جینے کا آجاتا ہنر
پھر مقدر دیکھتے کیسے تمہارے جاگتے

گھر کے آنگن میں سجا دیتے دیے تیرے لیے
تیرے آنے کی خوشی میں غم کے مارے جاگتے

کاش اس بحرِ سخن میں رات کے پچھلے پہر
کوئی موتی سر اٹھا لیتا تو دھارے جاگتے

شام ہی سے خوف ثاقبؔ ہے مسلط چار سو
جاگتا گر شہر میرا تو دلارے جاگتے

اب سخن کوئی دل پذیر نہیں
پاس اپنے جو رنگِ میر نہیں

منکرو ہو گئے ہو تم اندھے
چاند پر کیا کوئی لکیر نہیں

ہر طرف اب ہے ثبت سناٹا
شکر ہے اب کوئی اسیر نہیں

ہاتھ سر پر ہے سامنے تو نہیں
صاحبو! باپ ہوں فقیر نہیں

لے گیا حال شوخیاں ساری
کوئی بچہ بھی اب شریر نہیں

عشق میں ہم بھی سرخرو لیکن
آپ کی تو کوئی نظیر نہیں

اپنے سینے پہ لے لیے سارے
ان کمانوں میں کوئی تیر نہیں

عشق کیا ہے؟ فسانۂ مجنوں
حسن ہوتا ہے آتش لیلیٰ

بے سبب صدمات کی توصیف کرتے تھک گئے
ہجر کے لمحات کی توصیف کرتے تھک گئے

تھک چکے تھے دن میں سورج کی پرستش سے بہت
اور پھر ہم رات کی توصیف کرتے تھک گئے

اب تو ان تاروں کی یکسوئی میں ہو رد و بدل
ہم تو اس بارات کی توصیف کرتے تھک گئے

یہ نہیں دیکھا کسی نے کیا بچا کیا ڈھے گیا
ہاں مگر برسات کی توصیف کرتے تھک گئے

داستاں تکمیل تک پہنچی نہیں ہے آج بھی
سب ادھوری بات کی توصیف کرتے تھک گئے

چھوڑ کر صحرا پہ ہی برسی ہمیشہ کی طرح
لوگ تو برسات کی توصیف کرتے تھک گئے

خیر سے کچھ بھی نہیں بدلا ہمارے واسطے
ہم کہ ان حالات کی توصیف کرتے تھک گئے

"خود نما جذبات کی توصیف کرتے تھک گئے" (خیال امروہی)

حالِ دل کہہ کر اسے تو اپنے ہی دشمن ہوئے
جو سنائی اس نے تو چودہ طبق روشن ہوئے

دھوپ چھاؤں کا ہمیشہ کھیل بس ہوتا رہا
ہم سرِ چلمن ہوئے تو وہ پسِ چلمن ہوئے

کس نفاست سے ہمیں پرکھا گیا تھا بزم میں
جیسے ہم بازار میں رکھے ہوئے برتن ہوئے

اس فصیلِ وقت نے رکھا ہمیشہ قید میں
ہم کبھی کندن ہوئے ہیں تو کبھی آہن ہوئے

جب ضرورت آ پڑی اہلِ شبستاں کو کبھی
ہم سبھی بجھتے چراغوں کے لیے ایندھن ہوئے

اپنی ہی تصویر کو آخر کہاں تک دیکھتے
شہر میں جتنے تھے چہرے وہ سبھی درپن ہوئے

وسعتیں پہلے سی اب اپنے دلوں میں کب رہیں
آندھیاں ایسی چلیں دیوار و در روزن ہوئے

سرد کتنے ہو گئے سورج زمیں کی گود میں
کیسے کیسے ماہ و انجم قصۂ مدفن ہوئے

اب تعینِ سمتِ نو کا لوگ ثاقبؔ کیوں کریں
جس جگہ جو رک گئے ان کے وہی مسکن ہوئے

کتنا اکتایا ہوا ہجر کا مارا ہوا میں
منتشر ہوتا ہوا خود میں بکھرتا ہوا میں

یوں جھپٹتے ہیں صحیفانِ سخن اب مجھ پر
جیسے ان کے لیے ہوں طشت میں رکھا ہوا میں

اپنی آنکھوں میں تمنا کے جزیرے لے کر
اپنے حالات کے صحرا میں بکھرتا ہوا میں

اس میں رستوں کی شرارت کا کوئی دخل نہیں
تم کو مل جاؤں اگر راہ سے بھٹکا ہوا میں

میری سانسوں میں تواتر سے سماتا ہوا تُو
تیرے خوابوں میں سرِ شام اترتا ہوا میں

اب تو خود کو بھی میں پہچان نہیں پاتا ہوں
لمحے لمحے میں کئی رنگ بدلتا ہوا میں

سلطنت درد کی آباد رہے گی ثاقبؔ
چاند ہے، رات ہے، تنہائی میں لپٹا ہوا میں

میں محبت کی کسی ایک کہانی پہ رکوں
کیسے ممکن ہے کہ دریا کی روانی پہ رکوں

نام لکھا تھا کبھی ایک شجر پر تیرا
دل بضد آج بھی ہے تیری نشانی پہ رکوں

کاش کچھ حسنِ تکلم کا فسوں چھا جائے
کاش ایسا ہو تری جادو بیانی پہ رکوں

جب بھی ماضی کے جھروکوں میں سفر پر نکلوں
بھول جاؤں تو تری یاد دہانی پہ رکوں

شعر ہو عشق کا اور بات بھی وحشت والی
لفظ کو لے کے چلوں، حرف و معانی پہ رکوں

اپنی تو بس یہی معراجِ سفر ہے ثاقبؔ
لا مکانی سے چلوں اور مکانی پہ رکوں

خواب سے خواب کی تعبیر نہ روکی جائے
اب مرے درد کی تشہیر نہ روکی جائے

آنکھوں آنکھوں میں سخن جاری ہی رہنے دیجیے
عشق موضوع ہے، یہ تقریر نہ روکی جائے

یہ جنوں ہوش میں آجائے گا ناممکن ہے
اب کے دیوانے کی زنجیر نہ روکی جائے

اے ہوا! نقش مٹا جتنے مٹا سکتی ہے
مجھ کو بھی ضد ہے کہ تصویر نہ روکی جائے

یہ دعا ماں کی طرف سے ہے فرشتو سن لو
اس کی تا حشر بھی تاثیر نہ روکی جائے

چاہتے بھی ہو اندھیروں میں رہو عمر تمام
اس پہ شکوہ ہے کہ تنویر نہ روکی جائے

گھر ہواؤں میں بناتے ہیں چلو یوں ہی سہی
سن لے معمار یہ تعمیر نہ روکی جائے

معرکہ ختم نہیں ہوگا ابد تک ثاقبؔ
کربلا جاری ہے شمشیر نہ روکی جائے

برا ہو اب کہ اچھا، لکھ رہا ہوں
اُجالے کو اندھیرا لکھ رہا ہوں

مری ہمت ہے قرطاسِ جنوں پر
سمندر کو میں دریا لکھ رہا ہوں

اجالے شام بنتے جا رہے ہیں
اندھیروں کو سویرا لکھ رہا ہوں

مری ہر سوچ کیوں ہے منتشر سی
مجھے لکھنا تھا کیا، کیا لکھ رہا ہوں

میری بے باکیاں دیکھو تو یارو
خلاؤں کو کٹہرا لکھ رہا ہوں

مسلسل آنکھ سے آنسو رواں ہیں
مسلسل لفظ طیبہ لکھ رہا ہوں

جسے ثاقبؔ سبھی کچھ سونپ آیا
اُسی کو اب لٹیرا لکھ رہا ہوں

کیا تجھ کو ملا اتنا بتا خواب میں آ کر
میں سویا نہیں پھر تیری تصویر بنا کر

ہمت نہ بڑھا مجھ کو تسلی بھی نہ اب دے
بس ہاتھ اٹھا یار مرے اور دعا کر

نیرنگیٔ حالات سے شکوہ تو نہیں ہے
ہم بس نہ سکے خود کبھی صحرا کو بسا کر

بستی میں کوئی تجھ سا بھی دیوانہ نہیں ہے
رسوا تجھے ہونا ہے تو جی بھر کے ہوا کر

یہ شہر کسی کی بھی ضمانت نہیں دیتا
وہ لوٹ ہی آیا ہے تو اب شکر ادا کر

مانوس در و بام سے جتنا بھی ہے ثاقبؔ
تنہائی بری چیز ہے لوگوں سے ملا کر

اپنا انکار بھی اقرار پہ رکھ دیتی ہو
تم تو شرطیں بھی عجب پیار پہ رکھ دیتی ہو

کچے دھاگے سے کھنچا آتا ہوں میں رات گئے
اک دیا تم بھی تو دیوار پہ رکھ دیتی ہو

ٹھیک کرتی ہو جلا دینا ہی بہتر ہے اسے
روز ماچس کو جو اخبار پہ رکھ دیتی ہو

اپنی آنکھیں مری آنکھوں سے ملا کر اکثر
ہاتھ اپنا مرے اشعار پہ رکھ دیتی ہو

ہم کو چھٹی کا کوئی دن بھی میسر ہے کہاں
کام تم سارے جو اتوار پہ رکھ دیتی ہو

مختصر شب نہیں ہوتی ہے تو یہ تم جانو
شرط تم کیوں مری مقدار پہ رکھ دیتی ہو

کتنی عیار ہو تم عمر کے اس حصے میں
سارے الزام ہی معیار پہ رکھ دیتی ہو

کوئی غنچہ کسی دہن میں نہیں
موسمِ وصل اب چمن میں نہیں

اب تو سچائی محوِ ماتم ہے
اب کے سقراط انجمن میں نہیں

بے حسی خواب کھا گئی میرے
لطف آنکھوں کی اس جلن میں نہیں

پاس تم تھیں تو شعر ہوتے تھے
تم نہیں ہو تو جاں سخن میں نہیں

جیسے شعلہ کہاں چراغ کہاں
جیسے میرا بدن بدن میں نہیں

یہ تو فریادی بھی نہیں ہے کوئی
کچھ بھی تو اس کے پیرہن میں نہیں

اب یہ قبریں کہاں گڑھے ہیں فقط
اب کے مردے بھی تو کفن میں نہیں

میں صدا دوں کسے یہاں ثاقبؔ
اپنا تو کوئی بھی وطن میں نہیں

کچھ تو بے باکی ضروری ہے پرکھنے کے لیے
پاس آ کے بیٹھ جا مجھ کو سمجھنے کے لیے

اپنی آنکھوں میں جگہ دے یا مجھے آزاد کر
گھر تو آخر چاہیئے مجھ کو بھی رہنے کے لیے

شرط اتنی ہے کہ منزل کی ضمانت دے کوئی
دیر کتنی لگتی ہے رستہ بدلنے کے لیے

آسماں تیرے سبب سے ہے مرا روشن وجود
پر زمیں بھی چاہیئے ہر روز ڈھلنے کے لیے

یہ کتابِ زندگی پڑھنا تو پل کا کام ہے
وقت کتنا چاہیئے صفحہ بدلنے کے لیے

بک گیا کیا باپ غربت ڈھانپنے کے واسطے
کیا جہیز اب آچکا دلھن لے جانے کے لیے؟

اب خدا کے واسطے آجاؤ تم بھی بام پر
چاند بھی بیتاب ہے ثاقبؔ مچلنے کے لیے

کبھی یقیں تو کبھی اعتبار بن کے رہا
وہ شخص مجھ میں ہمیشہ بہار بن کے رہا

وہ کیوں سدا مری تردید کرنا چاہتا تھا
جو میرے سامنے بے اختیار بن کے رہا

تمام عمر ہی بکتا رہا کہیں نہ کہیں
کسی کے ہاتھ میں دل کاروبار بن کے رہا

وہی ہے تُو جو مجھے معتبر نہ سمجھا کبھی
وہی ہوں میں جو ترا اعتبار بن کے رہا

وہی ہے وحدتِ ربی وہی مکمل ہے
اکائی میں جو سدا بن کے بے شمار رہا

میں اپنی خواہشیں بس اس میں دفن کرتا رہا
یہ دل تو مجھ میں ہی میرا مزار بن کے رہا

مرے نہ ہونے کی تصدیق اس نے کر دی ہے
میں جس کی آنکھ میں ثاقب خمار بن کے رہا

تو مری جان اگر ہے تو مری سانسوں کو
اپنے انفاس سے ہر پل کو معطر کر دے

صلیب و دار کا موسم ابھی نہیں آیا
کہ جیت ہار کا موسم ابھی نہیں آیا

ابھی تو محوِ خزاں ہیں تمہارے دیوانے
ادھر بہار کا موسم ابھی نہیں آیا

ابھی تو کھیت میں سرسوں کے رنگ پھیکے ہیں
یہاں بہار کا موسم ابھی نہیں آیا

تو کیا فضا میں رہیں گے یہ طائرانِ چمن
تو کیا شکار کا موسم ابھی نہیں آیا

فضائے دید ابھی خوش گمان مت ہونا
صدائے یار کا موسم ابھی نہیں آیا

ابھی تو چاک گریباں نہیں یہاں تو سن
ترے سنگھار کا موسم ابھی نہیں آیا

تمہاری بدگماں آنکھوں میں وقت نے لکھا
کہ اعتبار کا موسم ابھی نہیں آیا

گلہ کروں بھی تو کس سے گلہ کروں ثاقبؔ
مرے قرار کا موسم ابھی نہیں آیا

بے چہرگی کے دور میں آنکھوں کا کیا شمار
جب چاند سامنے ہو تو تاروں کا کیا شمار

تو کیا ہوا جو ہو گئے محذوف چند پل
صدیوں کو جانچنا ہے تو گھڑیوں کا کیا شمار

بس چل پڑو کسی بھی طرف حوصلوں کے ساتھ
ہجرت کا سوچنا ہے تو رستوں کا کیا شمار

زندہ ہیں کتنے دیکھنا پڑتا ہے دوستو
اس شہرِ نامراد میں مردوں کا کیا شمار

پہلے سمیٹ لیجیئے ثاقبؔ ذرا ہمیں
بکھرے ہوئے وجود پہ زخموں کا کیا شمار

کارِ وحشت کا جب سبب نہ رہے
ہم بھی آوارگانِ شب نہ رہے

اس قدر کیوں ہو وقت سے نالاں
پہلے جیسے تو ہم بھی اب نہ رہے

یہ نہ ہو مَیں بھی خود کو کھو بیٹھوں
مجھ کو تیری کبھی طلب نہ رہے

اپنے تو خیر ہم نہ ہو پائے
یہ بتاؤ تمہارے کب نہ رہے

آئی ہچکی چلے گئے ثاقبؔ
شکر ہے اس کا جاں بلب نہ رہے

خدا کا نام لے اور میرا احتساب نہ کر
جو رہ گئے ہیں وہ لمحے مرے خراب نہ کر

ترے فرشتوں کو کاندھوں پہ عمر بھر رکھا
زمین زاد ہوں تُو مجھ سے اجتناب نہ کر

یہ شہرِ دیدِ نظارہ ہے رحم کر اس پر
تُو اپنے حسن کو آمادۂ حجاب نہ کر

نہیں نہیں مرے ایقان کو تُو رد کر دے
نہیں نہیں مجھے ہرگز تُو کامیاب نہ کر

مرا گلا ہی تو کاٹا ہے تُو نے اے پیارے
خطا معاف ہے تُو اس کا سدِ باب نہ کر

میں اپنے دستِ بریدہ سمیٹ لیتا ہوں
کوئی سوال نہ کر مجھ کو لاجواب نہ کر

جو وقت گزرے گا یہ اور روشنی دے گا
دیے کے سامنے اب عکسِ آفتاب نہ کر

مرے فسانے مرے ہیں کہانیاں بھی مری
میں ایک چہرہ ہوں ثاقبؔ مجھے کتاب نہ کر

اپنا قد حسبِ ضرورت میں بڑھا سکتا ہوں
خود کو میں تیرے برابر بھی تو لا سکتا ہوں

تو سمجھتا ہے کہ دنیا میں حسیں تُو ہی ہے
سامنے حسن کا انبار لگا سکتا ہوں

مجھ کو محدود مری نیند نہیں کر سکتی
اپنے خوابوں میں جدھر چاہوں میں جا سکتا ہوں

تجھ سے کچھ بھی نہیں مطلوب میرے لختِ جگر
اس ضعیفی میں بھی ہر بوجھ اٹھا سکتا ہوں

وحشتِ جاں تو مرا چھوڑ دے پیچھا ورنہ
سر پھرا ہوں میں کوئی حشر اٹھا سکتا ہوں

تیری تلوار طلب کرتی ہے گردن تو کرے
یہ قلم میرا ہے جب چاہوں چلا سکتا ہوں

اے مرے کربِ مسلسل! میں دلِ ثاقبؔ پر
تو نے جو حرف لکھا، اس کو مٹا سکتا ہوں

پرکھنے کے لیے خود کو ، گماں سے نکلو تو
تم اپنے حلقہء جانب دراں سے نکلو تو

ابھی تو عشق کا پہلا ہی مرحلہ ہے جناب
نماز بعد میں ، وقتِ اذاں سے نکلو تو

تمام عمر یہ تم کو بہائے رکھے گا
سو پہلے یوں کرو سیلِ رواں سے نکلو تو

امامِ عشق! یہ الفت میں کیوں جنوں خیزی
تم اپنی ذات کے آتش فشاں سے نکلو تو

بتائے کوئی کہ اس عشق سے بڑھوں کیسے
ہر ایک کہتا ہے اس امتحاں سے نکلو تو

پھر اس کے بعد زمانے پہ کھل ہی جاؤ گے
حصارِ حلقہ ٔ جادو گراں سے نکلو تو

یہیں پہ رک نہیں جاتی یہ کائنات کبھی
سنو کہ حجرۂ پیرِ مغاں سے نکلو تو

بنے گا راستہ دریا میں ایک روز کوئی
قدم اٹھاؤ اور اب درمیاں سے نکلو تو

سہیل اپنے بھی جینے کی کوئی ہو جائے
مگر یہ شرط ہے ثاقبؔ یہاں سے نکلو تو

اب کے آکاش پہ تارا بھی نہیں دیکھو گے
تم یقیناً میرا رستہ بھی نہیں دیکھو گے

تم جو مجبور رہو بے بس ہو مگر ایسا نہیں
تم کبھی عشق کا رتبہ بھی نہیں دیکھو گے

خشک سالی ہے مری آنکھ میں صحرا سے سوا
اب زباں پر مری شکوہ بھی نہیں دیکھو گے

دوستی کی تھی محبت تو نہیں کی تھی کبھی
آج کے بعد یہ جذبہ بھی نہیں دیکھو گے

لاتعلق مری وحشت سے اگر تم ہو جاؤ
میرا بکھرا ہوا کمرہ بھی نہیں دیکھو گے

اپنی آنکھوں کو اگر صبر کی حد میں رکھوں
آئینہ دیکھ کے چہرہ بھی نہیں دیکھو گے

عمر بھر کتنے ہی تمغوں سے نوازا ہے تمہیں
ایسی جھلمل میں تو فاقہ بھی نہیں دیکھو گے

میری تنہائی کے مجھ سے ہیں روابط ثاقبؔ
میرے جینے کا سلیقہ بھی نہیں دیکھو گے

اس کو شبِ وصال میں دیکھا نہیں گیا
عقدہ تعلقات کا کھولا نہیں گیا

کوشش تو کی تھی ہم نے کہیں دور جا بسیں
اس کے حصارِ عشق سے نکلا نہیں گیا

اک آئینے کے سامنے بیٹھے تمام عمر
یہ کیا کہ اپنا عکس بھی دیکھا نہیں گیا

بس دیکھتے رہے تھے سرِ سوئے آسماں
کچھ بھی تو اپنے واسطے مانگا نہیں گیا

جکڑا رہا وجود کو میرے تمام عمر
لے کر کہیں مجھے مرا رستا نہیں گیا

اُترے تھے خواہشوں کے جزیرے پہ ایک دن
پھر اس حصار سے کبھی نکلا نہیں گیا

دکھ اس کا ہے کہ ترکِ مراسم کے باوجود
ثاقبؔ وہ شخص ہم سے بھلایا نہیں گیا

"وہ چپ رہا تو ہم سے بھی بولا نہیں گیا" (عرفان صدیقی)

کبھی تمہاری کبھی اپنی آرزو رکھنا
بہت کٹھن ہے محبت کی آبرو رکھنا

کبھی تو اپنی بھی تقدیر جگمگائے گی
نئے ستاروں کی ہر لمحے جستجو رکھنا

ادھورے قصے کی تکمیل مجھ کو کرنی ہے
نہ ختم ہو کوئی شب بھر وہی سبو رکھنا

کسی بھی وقت صدا کربلا سے آئے گی
بچا کے جسم میں اپنے ذرا لہو رکھنا

یہ چاند تارے بجھے جا رہے ہیں اس کے لیے
وہ آ رہا ہے نگاہوں کو با وضو رکھنا

میں تلخ تر ہوں مگر سچ بیانیاں کیا ہوں
کہ داستاں کا تقاضا ہے رنگ و بو رکھنا

جو سوچنا تو سدا عشق سوچنا ثاقبؔ
جو رکھنا ہم سے محبت کی گفتگو کرنا

قربت و دوری کو چپ رہ کر بہم کر ہی دیا
دیکھ لو تم نے مری آنکھوں کو نم کر ہی دیا

دھیرے دھیرے زندگی میری سمجھ میں آ گئی
دھیرے دھیرے میں نے خود کو، خود میں ضم کر ہی دیا

دو قدم تم اور ہم سے دور آخر ہو گئے
فاصلہ منزل سے آخر دو قدم کر ہی دیا

خیمہءِ زینب کے شعلے کیا تجھے کم تھے کہ جو
سینہءِ عباس کو صرفِ علم کر ہی دیا

کون اب شکوہ زباں پر لائے گا ثاقبؔ یہاں
کاغذی سے پیرہن کو تم نے نم کر ہی دیا

بدگمانی پہ گر یقیں ہوتا
سامنا خود سے بھی نہیں ہوتا

زندگی جاگتی پھر اپنی بھی
اس مکاں میں کوئی مکیں ہوتا

وہ بھی محفل کمال محفل ہے
واں میں ہوتا ہوں پر نہیں ہوتا

سوچتا ہوں کہ دشتِ غربت میں
کوئی اپنا بھی ہمنشیں ہوتا

ان کی نعلین سامنے ہوتی
میں جھکائے ہوئے جبیں ہوتا

وحشتوں سے گریز جو کرتا
چشمِ نم ہوتی دل حزیں ہوتا

عشق کو عشق گر سمجھ لیتے
تُو مرا میں ترا امیں ہوتا

بیچ دیتا اگر انا ثاقبؔ
لمحہ لمحہ مرا حسیں ہوتا

فسانے عشق کے رنج و ملال ہی کے تو ہیں
یہ سلسلے سبھی خواب و خیال ہی کے تو ہیں

تمہاری بزمِ نگاراں سے منسلک ہم لوگ
بس اتنا ہے کہ فقط چند سال ہی کے تو ہیں

یہ کربِ عشق یہ دوراں کی تلخیاں ساری
یہ سارے سانحے کارِ محال ہی کے تو ہیں

ہمارے پاس بھلا کیا ہے اب سنانے کو
جو واقعات ہیں عہدِ جمال ہی کے تو ہیں

ہم اپنے عہدِ گریزاں میں اب بھی جیتے ہیں
یہ کیسے کہہ دیں کہ ہم حسبِ حال ہی کے تو ہیں

ہمارے کب رہے یہ وقت کے غلام رہے
شبِ فراق یہ دیپک وبال ہی کے تو ہیں

ہر ایک چاک گریباں ہر ایک چشمِ حزیں
جواب جتنے ہیں بس اک سوال ہی کے تو ہیں

یہ شاخ شاخ چنبیلی یہ شاخ شاخ گلاب
یہ معجزے سرِ گلشن کمال ہی کے تو ہیں

اگرچہ بات ساری حسن کی نہیں ہوتی
وگرنہ رنگ تمہارے جمال ہی کے تو ہیں

یہ دائرے تو بنائے ہیں ہم نے خود ثاقبؔ
ہمارے گرد سبھی حاشیے زوال ہی کے تو ہیں

اپنی وحشت سے الجھنے کا ہنر سیکھ لیا
زندگی تجھ کو پرکھنے کا ہنر سیکھ لیا

ہم تو خاموش ہیں، شکوہ نہیں کرتے تم سے
ہم نے گرتے ہی سنبھلنے کا ہنر سیکھ لیا

کھڑکیاں ساری کھلی رہتی ہیں اکثر گھر کی
شام کو شام سمجھنے کا ہنر سیکھ لیا

ساتھ دنیا کے چلے اپنی انا مار کے ہم
ہر کڑے پل سے نکلنے کا ہنر سیکھ لیا

ان ہواؤں کی عداوت کے سبب ہم نے بھی
راستہ اپنا بدلنے کا ہنر سیکھ لیا

ایک جام، ایک قلم، اک تری تصویر اور بس
تیری یادوں سے نمٹنے کا ہنر سیکھ لیا

تھا ترا حسنِ تغافل یا ضرورت کا فسوں
ہم نے دیوار سے لگنے کا ہنر سیکھ لیا

بات الفت کی کہاں سود و زیاں تک پہنچی
دل سے جو نکلی نہ تھی نوکِ زباں تک پہنچی

اس کو اندیشہ نہیں اپنے بھٹک جانے کا
کوئی سسکی جو کبھی کارِ گماں تک پہنچی

بوئے گل منزلِ مقصود کو پہچانتی ہے
مقتلِ جاں کی تمنا میں وہاں تک پہنچی

اس کا انجام تو بدنامی و رسوائی ہے
وہ کہانی جو مرے اشکِ رواں تک پہنچی

پیر آخر کو نکل آئے مری چادر سے
مصلحت میری جہاں حرفِ بیاں تک پہنچی

اپنے قد کا تجھے اب علم بھی ہو جائے گا
شاعری تیری بھی اب دیدہ وراں تک پہنچی

اس سے بڑھ کر بھلا رسوائی مری کیا ہوتی
بات ہجراں کی ہر اک اہلِ فغاں تک پہنچی

آئے اور میرا دل دکھا جائے
جا رہا ہے تو وہ چلا جائے

آؤ خود سے بھی گفتگو کر لیں
آج خود کو ذرا سنا جائے

سامنے آ گیا ہے دوراہا
تم بتاؤ کدھر مڑا جائے

مر گئے کتنے چھوڑ یے اس کو
زندہ لوگوں کو اب گنا جائے

ہائے دہلیز! تیری یہ خواہش
شام ہوتے ہی کوئی آ جائے

پھر کہیں خود کو ڈھونڈ لوں نہ کہیں
اس سے کہہ دو مجھے چھپا جائے

بادہ و جامِ مئے، رقصِ شعر و سخن، شام ڈھلنے کو ہے
بزمِ یاراں سجے گی ابھی جانِ من، شام ڈھلنے کو ہے

دن گزر جائے گا اپنی وحشت لیے سو کوئی غم نہیں
لوٹ آئیں گے سب طائرانِ چمن شام ڈھلنے کو ہے

ہجر کو وصل کے روپ میں لے کے میں آؤں گا دن ڈھلے
میری آغوش میں میرا ہوگا بدن، شام ڈھلنے کو ہے

یہ ستارے، قمر، چاندنی، بدلیاں ساتھ ہوں گے ترے
دو گھڑی ٹھہر جا میرے دیوانے پن شام ڈھلنے کو ہے

سرخ ملبوس میں آج سمٹی ہوئی چاندنی کی کرن
مست آنکھیں لیے ایک شعلہ بدن، شام ڈھلنے کو ہے

اس میں کیا فلسفہ، اس میں کیا سوچنا، منتظر میں بھی ہوں
راستہ بھول جانا نہیں تم سجن شام ڈھلنے کو ہے

روز جیسا رہا آج کا دن بھی ہم سے گزر ہی گیا
اس کی یادوں میں گم اپنی دھن میں مگن شام ڈھلنے کو ہے

حل کوئی اب شبِ ہجر کا ڈھونڈ لو ورنہ پچھتاؤ گے
بڑھ نہ سینے کی جائے کہیں پھر جلن شام ڈھلنے کو ہے

یہ آنکھیں شام کا جب اعتبار کرتی ہیں
ستم ظریف بڑا بے قرار کرتی ہیں

جواب جس کا خموشی بغیر کچھ بھی نہیں
سوال آپ وہی بار بار کرتی ہیں

ہر اک چراغ کی لو تھرتھرانے لگتی ہے
ہوائیں جب بھی سمندر کو پار کرتی ہیں

تمہیں تو ہجر نے کمرے میں قید رکھا ہے
مری تو آنکھیں ستارے شمار کرتی ہیں

تمام عمر اپنے والدین کا ثاقبؔ
یہ بیٹیاں ہی سدا انتظار کرتی ہیں

چاند تاروں کے جو انبار پہ رکھا ہوا ہے
اک دیا ہم نے بھی دیوار پہ رکھا ہوا ہے

تم نے کاٹی ہے کہیں دیپ جلاتے ہوئے رات
ہم نے بھی ہجر کو آزار پہ رکھا ہوا ہے

جب کسی طور بدلتا ہی نہیں تو ہم نے
اپنا دکھ عرصۂ دشوار پہ رکھا ہوا ہے

اپنی زلفیں میرے سینے سے ہٹا لو اب کے
بوجھ اتنا دلِ بیکار پہ رکھا ہوا ہے

دل دریچے میں تجھے دیکھ کے احساس ہوا
جیسے بادل کوئی کہسار پہ رکھا ہوا ہے

میں نہیں جاؤں گا دہلیز سے تیری اٹھ کر
میرا جانا ترے دیدار پہ رکھا ہوا ہے

منکرِ عشق تو انکار بھی کر سکتا ہے
ہر گنہ ہم نے جو اقرار پہ رکھا ہوا ہے

حوصلہ ٹوٹ نہ جائے کہیں میرا کیونکہ
ایک عالم مری دستار پہ رکھا ہوا ہے

مقتلِ شب بھی تماشائی ہوئی ہے ثاقبؔ
ایک جلتا ہوا سر دار پہ رکھا ہوا ہے

جیسے پلِ صراط کو سر کر رہے ہیں ہم
کیوں زندگی کو زیروزبر کر رہے ہیں ہم

اچھی بری کا کیا ہے بسر ہو گئی حیات
دیکھو تمہارے بن بھی گزر کر رہے ہیں ہم

اب دیں بھی کیا حسابِ غمِ زندگی تجھے
روزِ ازل سے رقصِ شرر کر رہے ہیں ہم

اک آس رات کو ذرا کرتی گئی طویل
شب پھر بھی کٹ گئی ہے سحر کر رہے ہیں ہم

آنکھوں میں رتجگوں کے مناظر لیے ہوئے
حیرت کی بات ہے کہ سفر کر رہے ہیں ہم

جیسے کہ اپنے اشک کی وقعت نہیں کوئی
جیسے کسی کو ملک بدر کر رہے ہیں ہم

شیشہ گری تھا کام ہمارا تمام عمر
بیکار پتھروں پہ ہنر کر رہے ہیں ہم

پھر اس کی ذات راہ میں ثاقبؔ یوں آ گئی
پھر اپنا آپ صرفِ نظر کر رہے ہیں ہم

محبت کی ہے تو ایسی کوئی تدبیر کرتا جا
مجھے اپنا بناتا جا مجھے تسخیر کرتا جا

کسی لمحے بھی زندانِ محبت چھوڑ سکتا ہوں
میرے پیروں میں چکر ہے مجھے زنجیر کرتا جا

مکمل، حشر تک بھی ماتمِ گریہ نہیں ہو گا
سسکتے منظروں کو تو یہاں تصویر کرتا جا

لگا ہر روز اک سنگِ محبت بیتِ الفت میں
مجھے ہونا ہے تیرا تو مجھے تعمیر کرتا جا

ترا احسان ہو گا لمس جو تیرا اسے چھو لے
کہ یہ زہر ہلاہل ہے اسے اکسیر کرتا جا

کوئی مصرع ہی بخشش کا سبب بن جائے گا تیری
سخن اپنا بنامِ حضرتِ شبیر کرتا جا

ازل سے ویسے بھی جھگڑے محبت کے نہیں ہیں کم
سوادِ عشق کو تو اور بھی گھمبیر کرتا

خوشا کہ عشق کا مطلب بتانے آئے ہیں
یہ لوگ مجھ کو محبت سکھانے آئے ہیں

سکوتِ شب مجھے وحشت کا درس دیتی ہے
ستارے ہجر کا مطلب بتانے آئے ہیں

سنا ہے جشنِ جنوں آج ہی بپا ہو گا
سنا ہے شہر میں ہم سے دِوانے آئے ہیں

میں زندگی کو سمجھنے میں ہوں بہت مصروف
تو آپ کیوں مجھے حیرت سکھانے آئے ہیں

حوالے کر کے اذیت پسند لوگوں کے
یہ لوگ میرا جنازہ اٹھانے آئے ہیں

جنھیں خبر نہیں اپنی کوئی مجھے وہ لوگ
خدا کی شان ہے رستہ دکھانے آئے ہیں

جہاں سے کل کو نکالے گئے تھے ہم ثاقبؔ
وہیں پہ آج پھر رشتے بنانے آئے ہیں

خوش نصیبی ہے کہ میں اس کی رضا تک آ گیا
دینے والا خود مرے دستِ دعا تک آ گیا

تھک کے کیا بیٹھا میں رستے میں تو پھر میری طرف
خود مری منزل لیے یہ راستہ تک آ گیا

حسن آخر ساتھ دیتا بھی تو دیتا کب تلک
زُعم اس کا دھیرے دھیرے التجا تک آ گیا

جس میں آنکھیں خشک تو دل سنگ کی مانند ہوا
میں بھی آخر عشق کی اس انتہا تک آ گیا

مومنو! ایسی شہادت کس کو ہوتی ہے نصیب
تھا وہ قسمت کا دھنی جو کربلا تک آ گیا

اے مری جانِ غزل اے محورِ فخرِ سخن
شعر تجھ پہ کیا لکھا میں ابتلا تک آ گیا

اور کیا اب چاہتی ہے زندگی مجھ سے مری
اپنی وحشت کو لیے کرب و بلا تک آ گیا

کس لیے نظریں ہیں اب بھی اس ترازو کی طرف
اب تو اس جانب سے ثاقبؔ فیصلہ تک آ گیا

تجھ سے الفت کا سبب تجھ سے محبت کا سبب
آج تک سمجھا نہیں اپنی بھی حالت کا سبب

مل لیے، بیٹھ لیے، باتیں بھی کچھ کچھ کر لیں
بس یہی ہو گا مری جان رفاقت کا سبب

ہر کوئی غور سے پڑھتا ہی رہا تھا مجھ کو
لکھ دیا وقت نے چہرے پہ قناعت کا سبب

کچھ تو ہو گا سرِ محشر جو مرے ساتھ ہو تم
کچھ تو ہو گا ہی مری جان عنایت کا سبب

روز سورج سے ملاتا تھا نگاہیں اپنی
پوچھ بیٹھا وہ میری اتنی ریاضت کا سبب

اب کے ہنگامہء فردا سے بھلا کیسا گریز
ہو نہ جائے مری تنہائی ہی وحشت کا سبب

اس لیے گھر سے نکلتا ہی نہیں ہوں ثاقبؔ
بس کوئی پوچھ نہ بیٹھے میری فرصت کا سبب

خوشا کہ بزم میں سب باکمال بیٹھے ہیں
قدم قدم پہ مرے ہم خیال بیٹھے ہیں

حصولِ رزق، سفر، عشق، حوصلے، دنیا
ہمارے سامنے کتنے سوال بیٹھے ہیں

ملی ہے ان کو بھی تو آمدِ خزاں کی خبر
پرندے پیڑ پہ اب خال خال بیٹھے ہیں

متاعِ ضبط کو دل میں چھپا کے رکھا تھا
یہ کیا ہوا ہے ترے غم اُجال بیٹھے ہیں

مثال ڈھونڈتے ہیں آپ بزم یاراں میں
کہاں آپ یہاں بے مثال بیٹھے ہیں

تھکے ہوؤں کو بتا دے ہوائے شہرِ بتاں
محاذِ عشق پہ ہم بھی نڈھال بیٹھے ہیں

ہے نقش دونوں طرف جس کے ہجر کی صورت
ہوا میں ہم وہی سکہ اچھال بیٹھے ہیں

سبھی بکھر چلے ہیں بزمِ یار میں ثاقبؔ
عجیب ہم ہیں جو خود کو سنبھال بیٹھے ہیں

ابھی تو نقل مکانی نہیں ہے سو جاؤ
ابھی سفر کی بھی ٹھانی نہیں ہے سو جاؤ

سماعتوں تلک بس اک صدا ہی آتی تھی
یہاں کہیں پہ بھی پانی نہیں ہے سو جاؤ

ہے جن کو عشق سے رغبت وہ جائیں صحرا کو
تمہیں تو خاک اڑانی نہیں ہے سو جاؤ

ابھی تو چاک گریبانیوں کا موسم ہے
ابھی تو کوئی گرانی نہیں ہے سو جاؤ

یہ نیند کتنی ہے سفاک چاہنے پر بھی
میں جانتا ہوں کہ آنی نہیں ہے سوجاؤ

طلوعِ صبح پہ سوچیں گے کس طرف جائیں
ہمیں یہ رات گنوانی نہیں ہے سوجاؤ

سرائے خانۂ وحشت میں کر گزرنے کی
ابھی تو تم نے بھی ٹھانی نہیں ہے سوجاؤ

تمام رات بھی جاگے تو کچھ نہیں ہوگا
جو سر پہ آ گئی جانی نہیں ہے سوجاؤ

تم اتنی رات گئے جاگتے ہو کس دکھ میں
تمہیں تو آگ لگانی نہیں ہے سوجاؤ

معاملات ہیں یہ دھوپ چھاؤں کے ثاقبؔ
وصال وہجر کہانی نہیں ہے سوجاؤ

"یہ رات بھر کی کہانی نہیں ہے سوجاؤ" (لیاقت علی عاصم)

جلال و حشمت و عزت مآب سے باہر
کبھی تو آؤ ذرا اس سراب سے باہر

شعورِ ذات نے اس کو حصار میں رکھا
جو ایک خواب ملا اور خواب سے باہر

جہاں جہاں بھی محبت، خلوص، لکھا تھا
سبق وہ ہو گئے سارے نصاب سے باہر

کسی طرح تو کوئی رابطہ بحال کروں
کوئی تو چہرہ دِکھے اب نقاب سے باہر

سوال تھا کہ گھٹا کب یہاں پہ برسے گی
کھلی فضا میں دکھے سب جواب سے باہر

پلٹنا پڑ گیا پھر عالم جنوں میں مجھے
سکوتِ مرگ تھا اس اضطراب سے باہر

ہر ایک لب پہ سجی ہو گی پھر غزل کی طرح
نکل کے آنا نہ میری کتاب سے باہر

ہوئی جو شام تو چپ سادھ لی ہے سورج نے
لو وہ بھی آگیا ہے آب و تاب سے باہر

فصیل ہوش سمجھ لے حکایتِ ثاقبؔ
خمار الجھے گا جامِ شراب سے باہر

خریداروں میں کیوں آخر گنوایا جا رہا ہے
میں بے قیمت ہوں پر مجھ کو کمایا جا رہا ہے

زُلیخا پھر کبھی واپس نہیں آئی یہاں پر
مگر بازار تو ہر دن سجایا جا رہا ہے

ہمارا صبر پرکھا جا چکا ہے بارہا اور
ہمارے ظرف کو بھی آزمایا جا رہا ہے

ہماری نسلِ نَو تو صرف قصے ہی سنے گی
مقاماتِ مقدس کو گرایا جا رہا ہے

مجھے اس زندگی سے کوئی بھی رغبت نہیں ہے
تو پھر احسان کیوں مجھ پر جتایا جا رہا ہے

وہ قصہ جس میں شامل تھا مرا کردار ثاقبؔ
نجانے کیوں وہی مجھ سے چھپایا جا رہا ہے

وہ بحرِ عشق تھا جس کا کنارہ ہو بھی سکتا تھا
کوئی تنکا مرے دل کا سہارا ہو بھی سکتا تھا

بھلا اب فائدہ کیسا لکیریں پیٹتے کیوں ہو
کبھی تو روٹھنے والا تمہارا ہو بھی سکتا تھا

تری تکریم واجب تھی جو خاموشی سے بیٹھے تھے
وگرنہ بزم میں کوئی اشارہ ہو بھی سکتا تھا

ہمی نے سر اٹھا کر راستہ چلنا نہیں سیکھا
ہمارے ساتھ بھی ورنہ ستارا ہو بھی سکتا تھا

ہمیں جینے کو تعبیروں کی حاجت ہی نہیں رہتی
تمہارے خواب سے اپنا گزارا ہو بھی سکتا تھا

کوئی دستک جگا سکتی ہے ان سوئے دریچوں کو
کسی لمحے بلانے کا اشارہ ہو بھی سکتا تھا

وہ جس ترکِ تعلق پہ مجھے افسوس ہوتا ہے
اسی سے رابطہ اپنا دوبارہ ہو بھی سکتا تھا

سخن میں سادگی اپنائی تھی ثاقبؔ یہاں ورنہ
وہ اپنی ذات میں ورنہ ادارہ ہو بھی سکتا تھا

مجھے ہر کوئی مجھ سا لگ رہا ہے
مجھے یہ مہنگا سودا لگ رہا ہے

سنبھل جا اے دلِ ناداں سنبھل جا
محبت کا یہ رستا لگ رہا ہے

سنو اک بات میں تم کو بتاؤں
مجھے کیوں عشق دھوکا لگ رہا ہے

کہانی بڑھ رہی ہے دھڑکنوں میں
ہر اک کردار زندہ لگ رہا ہے

یہ تاریکی بڑی مانوس ہے تو کیا
مجھے اس میں اجالا لگ رہا ہے

ہر اک منظر میں پس منظر ہے شاید
ہر اک چہرہ ادھورا لگ رہا ہے

مجھے تو وحشتوں کا سامنا ہے
مگر تو کیوں اکیلا لگ رہا ہے

میں اک تاریخ لکھنے جا رہا ہوں
مجھے یہ روم اچھا لگ رہا ہے

اے دریا! تجھ سے ملنا ہے قیامت
کہ تیرا درد گہرا لگ رہا ہے

دکھ میں اب ہم کو دلاسا بھی نہیں ہے کوئی
اب ہمیں ڈانٹنے والا بھی نہیں ہے کوئی

غم کی تحویل سے نکلے ہی نہیں آج تلک
قرض جاں ہم نے اتارا بھی نہیں ہے کوئی

تیرا احسان بھی کیا لینا ہے اپنے سر پر
زندگی! تیرا سہارا بھی نہیں ہے کوئی

کس لیے عشق پہ الزام دھرے جاؤں کہ اب
میرے پہلو میں تو رہتا بھی نہیں ہے کوئی

عمر بھر چلتا رہا اب یہ ہوا ہے معلوم
میری منزل مرا رستا بھی نہیں ہے کوئی

شیشۂ صدق تو مدت سے پڑا ہے ویراں
اس میں کیا دیکھوں کہ چہرہ بھی نہیں ہے کوئی

شب کی تنہائی میں ہم سوچ رہے تھے ثاقبؔ
کیا ہمیں آپ سے شکوہ بھی نہیں ہے کوئی

یعنی ہر اک نظر سے محبت چلی گئی
سو شہرِ جاں سے رسمِ اخوت چلی گئی

سو رفتگاں بھی حصہ ء تاریخ ہو گئے
گنجینہ ء بہار کی نکہت چلی گئی

اس کاروبارِ غم کا سمٹنا محال تھا
اب ماننا پڑا ہے کہ ہمت چلی گئی

اب اور زندگی سے بھلا کیا طلب کریں
لے دے کے اپنے ساتھ تھی وحشت، چلی گئی

حیرت سے آشنائیاں تو عمر بھر کی تھیں
پھر کیوں ہماری چشمِ بصیرت چلی گئی

پہلے سخن میں اپنی روانی بلا کی تھی
اک وقت یہ بھی آیا ریاضت چلی گئی

خود سے تمام عمر مرا معرکہ رہا
اب یوں لگا کہ سانس کی مہلت چلی گئی

ثاقبؔ یوں اپنا حالِ جنوں عشق میں ہوا
آئی تھی ہم سے ملنے قیامت چلی گئی

رات شبنم نے بھگو ڈالے شجر جتنے تھے
گر پڑے ٹوٹ کے شاخوں سے ثمر جتنے تھے

ہاتھ کٹتے تھے کسی دور میں لیکن اب تو
زندہ درگور ہوئے اہلِ ہنر جتنے تھے

ہم سے کیوں پوچھ رہے تھے ترے گھر کا رستہ
لوگ دیوانے سرِ راہ گزر جتنے تھے

رزق نے چھین لی گلیوں کی متاعِ رونق
تھے مکیں اتنے ہی یارو وہاں گھر جتنے تھے

آخرش حبس زدہ لوگ گھروں سے نکلے
اتنی دیواریں نہ تھیں شہر میں در جتنے تھے

معرکہ ہونا تھا ہر اک کا سو حیرت کیسی
سرحدِ عشق پہ تھے، زیر و زبر جتنے تھے

یہ سیاست ہی کی نیرنگی ہے ثاقبؔ کہ یہاں
مخملی فرش پہ ہیں خاک بسر جتنے تھے

دل میں اک حسرتِ نایاب لیے بیٹھے ہیں
ہم درِ خواب پہ اِک خواب لیے بیٹھے ہیں

لوگ اب کھل کے کیا کرتے ہیں اظہارِ ہوَس
اور ہم عشق میں آداب لیے بیٹھے ہیں

تیرے عارض، ترے گیسو، تری آنکھیں، ترے لب
دیکھ ہم جینے کے اسباب لیے بیٹھے ہیں

کیا زمانہ تھا کہ ہوتے تھے سمندر میں بھنور
اب تو ساحل یہاں گرداب لیے بیٹھے ہیں

کیوں نہ اس شہر میں ہم نام چھپائیں اپنا
جس میں گم نام بھی القاب لیے بیٹھے ہیں

تم بھی حالات سے مایوس ہوئی لگتی ہو
ہم بھی مرتے ہوئے اعصاب لیے بیٹھے ہیں

اک طرف حسن کے جلووں کی نمائش ہے بپا
اک طرف ہم دلِ بے تاب لئے بیٹھے ہیں

اب کوئی بارِ دگر ہم سے نہیں ہو سکتا
عشق میں رقصِ شرر ہم سے نہیں ہو سکتا

جس کی چھاؤں میں ہے اجداد کی خوشبو شامل
کاٹ دیں ایسا شجر، ہم سے نہیں ہو سکتا

ایسی وحشت میں کہاں عمر بتائی جائے
ایسا اک دن بھی بسر ہم سے نہیں ہو سکتا

پھر کسی خواب کو آنکھوں میں بسا کر چلنا
اب شبِ ہجر! سفر ہم سے نہیں ہو سکتا

بزمِ جاناں میں سبھی دیر تلک بیٹھے رہے
ہم بھی رک جاتے مگر ہم سے نہیں ہوسکتا

حشر کی بات بھی ہو اور نہ ہو اپنا حساب
رات میں رنگِ سحر ہم سے نہیں ہوسکتا

بات بس اتنی سی ہے جب وہ مقابل آئیں
ہم رہیں سینہ سپر، ہم سے نہیں ہوسکتا

ہست کا کیا ہے بھلا اور بھلا بُود کا کیا
سر جھکا دے بڑے شوق سے مسجود کا کیا

اک جزا ہی کی طلب تھی سرِ محشر اس سے
بخش ہی دیتا کہ جاتا مرے معبود کا کیا

کوئی الزام ہو سر اپنے ہی دھرنا ہوگا
صرف بربادی مقدر ہو تو بہبود کا کیا

اب یہی فکر ہے بازارِ جنوں میں ہم کو
اصل مل جائے غنیمت ہے یہاں سود کا کیا

کیوں پریشان نظر آتے ہیں اتنے ثاقبؔ
ڈھونڈ ہی لے گا ہمیں اس دلِ مفقود کا کیا

دکھائی دیتا نہیں پھر بھی ہر چمن میں رہے
کہ جیسے روحِ مقدس کسی بدن میں رہے

امیرِ شہر کا فرمان ہو گیا جاری
ہر ایک شخص ہی کاغذ کے پیرہن میں رہے

وہ گلبدن وہ سراپا جمالِ حسنِ جہاں
یہ کیا کہ جب بھی ملے حلقۂ سخن میں رہے

ابھی چمن میں خزاؤں کا راج ہے قائم
اسے بتا دو کہ بہتر ہے گر وہ بن میں رہے

یہ چاند تارے، یہ خورشید اور یہ ہفت افلاک
ازل سے تا بہ ابد اپنے بانکپن میں رہے

زمیں پہ ٹھیک سے چلنا بھی سیکھ پائے نہیں
جو آسمان کو چھونے کی بس لگن میں رہے

تمہارے دل میں جگہ ہم بنا نہ پائے مگر
جبینِ ناز کی ثاقبؔ ہر اک شکن میں رہے

میں خشک پتہ ہوا ہیں، شجر میں ہوں ہی نہیں
صدا تو سنتا ہوں لیکن میں گھر میں ہوں ہی نہیں

یہ سوچ کر کبھی روکا نہیں اسے میں نے
کہ سنگِ میل ہوں، رختِ سفر میں ہوں ہی نہیں

تمہارے حسنِ تغافل کی بات چل نکلی
خبر میں ہوتے ہوئے مَیں خبر میں ہوں ہی نہیں

تو دل میں دیکھ، مجھے راہ میں تلاش نہ کر
جدھر تو ڈھونڈ رہا ہے اُدھر میں ہوں ہی نہیں

فقیر منش ہوں، دنیا سے لاتعلق ہوں
مجھے نہ دیکھ، مَیں اہلِ نظر میں ہوں ہی نہیں

بتا کہ اب مجھے یا رب کہاں پہ جانا ہے
میں مبتلائے جنوں ہوں، شر میں ہوں ہی نہیں

نہ جانے کیوں وہ مری جستجو میں نکلا ہے
میں خود کو ڈھونڈ رہا ہوں مگر میں ہوں ہی نہیں

یہ بدنصیب خد و خال ثبت ہیں مجھ پر
نظر میں ہوتے ہوئے بھی نظر میں ہوں ہی نہیں

ہے میرا حجرہءِ دانشوراں سے کیا ناتا
کہ میں تو ان کی صفِ معتبر میں ہوں ہی نہیں

بڑے ہی شوق سے سنتا ہوں کیوں اسے ثاقبؔ
میں جس کہانی کے زیر و زبر میں ہوں ہی نہیں

یہ زُعم کس کے لیے ہے فتور کس کے لیے
لکیر پیٹ رہے ہو حضور کس کے لیے

جو خواب بھی کوئی دیکھے تو آنکھ بھر آئے
جو دل دکھائے وہ رقص و سرور کس کے لیے

جزا سزا کے بھی گر مستحق ہمی ٹھہرے
ظہور کس کے لیے، کوہِ طور کس کے لیے

جو اپنی ذات میں تنہا رہا ہو مدت سے
تعلقات کا اس کو شعور کس کے لیے

نہیں، یہ آخری منزل نہیں تھی دنیا میں
یہاں قیام ہے اہلِ قبور کس کے لیے

عجیب وصل ہے جو ہجر سا دکھائی دے
قریب ہو کے بھی آخر ہو دور کس کے لیے

قدم جمائے کھڑے تھے جو یاں گرانی میں
وہ ریزہ ریزہ ہوئے شوقِ سائبانی میں

مرا تو ثانوی کردار تھا محبت میں
نجانے کیوں سے مجھے مارا گیا کہانی میں

لبوں پہ مہر لگائی گئی شباتِ جہاں!
بجھے ہیں لفظ مرے دردِ بے زبانی میں

کہا نہیں تھا توکل پہ چل رہا ہے نظام
اُجڑ گئے ہو زمانے کی بدگمانی میں

کشید کرتا ہوں ہر شب سے اپنا دن ثاقبؔ
میں جی رہا ہوں اسی کربِ ناگہانی میں

نہ سوال میں نہ جواب میں کہیں کھو گیا
مرے محتسب میں حساب میں کہیں کھو گیا

مری زندگی کی کتاب کے کئی باب تھے
میں انہی کے تو کسی باب میں کہیں کھو گیا

کہیں بزم جاں میں سخن کی کوئی اداس تھی
میں تمہارے حسنِ خطاب میں کہیں کھو گیا

یہ جو دن بہ دن بشر اپنی زات میں گم ہوا
وہ حصول کنزِ ثواب میں کہیں کھو گیا

یہ جو بیچ میں اک خلا سا ہے اسے کیا کہوں
میں ازل سے ایسے نقاب میں کہیں کھو گیا

وہ جو تشنہ لب کو دکھا تھا پانی سرِ سفر
وہ تو چشمِ تر کے سراب میں کہیں کھو گیا

یہ زعم کس کے لیے ہے فتور کس کے لیے
لکیر پیٹ رہے ہو حضور کس کے لیے

جو خواب بھی کوئی دیکھے تو آنکھ بھر آئے
جو دل دکھائے وہ رقص و سرور کس کے لیے

جزا سزا کے بھی گر مستحق ہمی ٹھہرے
ظہور کس کے لیے کوہ طور کس کے لیے

جو اپنی ذات میں تنہا رہا ہو مدت سے
تعلقات کا اس کو شعور کس کے لیے

نہیں، یہ آخری منزل نہیں تھی دنیا میں
یہاں قیام ہے اہلِ قبور کس کے لیے

عجیب وصل ہے جو ہجر سا دکھائی دے
قریب ہو کے بھی آخر ہو دور کس کے لیے

میں اپنے آپ سے بیزار کر دیا گیا ہوں
میں کس عذاب سے دوچار کر دیا گیا ہوں

تمہیں تو خانۂ دل میں بسائے رکھا تھا
تو پھر میں کس لیے مسمار کر دیا گیا ہوں

بڑی روانی سے دنیا نے جھوٹ بولا تھا
میں سنگِ راہ سے شہکار کر دیا گیا ہوں

زبانِ خلق جسے عشق کہہ رہی ہے یہاں
میں اس عذاب سے دوچار کر دیا گیا ہوں

ہر ایک سانس کٹھن ہو گئی ہے میرے لیے
میں اپنی ذات میں بیمار کر دیا گیا ہوں

شوقِ تعمیر میں بس حرف کی دلداری کی
ہم نے جینے کی فقط اچھی اداکاری کی

وہ بچھڑنے کی گھڑی کارِ اذیت ہی سہی
خود کو جھٹلایا مگر اس کی طرفداری کی

رات کا خوف بھی لاحق تھا، اکیلا پن بھی
دلِ آشفتہ سروں نے جو عزاداری کی

اب مروت کی فضا سے بھلا کیسے نکلیں
ہم نے ہر دور میں جی جاں سے جہانداری کی

بے گھری جن کو ملی آج بھی بے گھر ہی رہے
وہ نوازے گئے جن لوگوں نے غداری کی

مشورہ مان لیا ترکِ تعلق کا مگر
عمر گزری تو مرے دل نے سمجھداری کی

بلا رہا ہے کسی دائمی اذیت کو
کہ ہجر آنکھ دکھانے لگا محبت کو

بتا اے چشم دریدہ سنبھل کے کیا کرتا
کہ آئینے میں بھی رکھا گیا تھا حیرت کو

یہ اپنا حل بھی تو خود ساتھ لے کے آتی ہے
میاں میں کیسے مصیبت کہوں مصیبت کو

مرا وجود ہر اک پل جو خاک کرتی ہے
خدایا آگے لگے ایسی ہر ضرورت کو

مرا بدن جو سرِ شام راکھ کرتی ہے
خدایا آگ لگے لمس کی ضرورت کو

جو ہوش ہوتا تو پڑھتا میں عشق کی تحریر
جنوں میں پڑھ نہیں پایا کسی عبارت کو

اسی کے دم سے تو بابِ سخن ہے وَا ثاقب
دعائیں دیتا ہوں ہر پل میں اپنی وحشت کو

تمت بالخیر